ترتیب

سرورق ۔ عمل ۔ پی ۔ کے سین گپتا

اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

نئی دہلی

آجکل

ایڈیٹر

مہدی عباس حسینی

ٹیلیفون نمبر :- ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد (۳۲) شمارہ (۱۰)

مئی ۱۹۷۴ء

بیساکھ جیٹھ شک سمت ۱۸۹۶

شرحِ چندہ

سالانہ	دس روپے	۱ پونڈ	۳ ڈالر
دوسالہ	۱۷ روپے	۱۰/۱ پونڈ	۵ ڈالر
سہ سالہ	۲۴ روپے	۴۰/۲ پونڈ	۷ ڈالر
فی پرچہ	ایک روپیہ	۱۰ پینی	۳۰ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر "آج کل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

زرِ ر کا پتہ

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جواہر لال نہرو (۱۴ر نومبر ۱۸۸۹ء تا ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء)

مجھے ہندوستان کی جنتا سے اتنا پیار ملا ہے کہ چاہے جو کچھ بھی
کروں وہ اس پیار و محبت کے چھوٹے سے حصے کا بھی بدلہ نہیں ہو سکتا
اور بلا شبہ پیار جیسی بیش قیمت چیز کی کوئی قیمت بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔
(وصیت)

پنڈت نہرو نے اور ان سے پہلے ان کے گرو مہاتما گاندھی نے ہماری جیون کی جڑ کو اس طرح بو یا تھا کہ جب تک ہم میں ایکا نہیں ہوگا ہم اچھی زندگی نہیں گذار سکیں گے۔ اس ایکتا کے لئے آپ اپنے دل میں فیصلہ کر لیجئے کہ کسی ہندوستانی کا ہاتھ، چاہے وہ ہندو کا ہو، مسلمان کا ہو، چاہے سکھ کا ہو یا پارسی کا ہو کسی دوسرے ہندوستانی پر نہیں اٹھے گا۔ اگر اُٹھے گا تو اُسے روکنا ہوگا۔ پنڈت نہرو کے نام پر روکنا ہوگا۔ مہاتما گاندھی کے نام پر روکنا ہوگا ... ہم یہ نہیں کر سکیں گے تو پنڈت نہرو مر جائیں گے۔ ہم یہ نہیں کر سکیں گے تو گاندھی جی بھلا دیے جائیں گے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ۲۹ مئی ۱۹۶۴ء

ڈاکٹر ذاکر حسین (۸ر فروری ۱۸۹۷ء تا ۳ر مئی ۱۹۶۹ء)

سارا ہندوستان میرا گھر ہے اور اس کے لوگ میرا کنبہ۔ عوام نے
ایک مخصوص مدت کے لئے مجھے اس کنبے کا سربراہ منتخب کیا ہے۔
میں اس گھر کو مستحکم اور خوبصورت بنانے کی پُرخلوص کوشش کرونگا
تاکہ یہ گھر اُن عظیم انسانوں کے شایانِ شان بن سکے جو
ایک منصفانہ، خوش حال اور شائستہ نظام زندگی کی تعمیر میں لگے ہیں۔

(ڈاکٹر ذاکر حسین - ۱۳ر مئی ۱۹۶۷ء، صدر جمہوریہ ہند کا عہدہ سنبھالنے کے بعد تقریر)

"ڈاکٹر ذاکر حسین صحیح معنوں میں "اجات شترو" تھے اور اُن کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔"

شری وی وی گری

"غالباً کسی بھی فردِ واحد سے زیادہ وہ ملک کے اتحاد و یگانگی کے علمبردار تھے۔ ہندوستان کے گوناگوں تمدن کی خوبیاں اُن کی شخصیت میں یکجا ہو گئی تھیں اور انہوں نے اپنے کردار و گفتار سے عوامی زندگی کا معیار بلند کیا تھا۔"

شریمتی اندرا گاندھی

نثار احمد فاروقی
دلّی کالج - دلّی - ۱۱۰۰۰۶
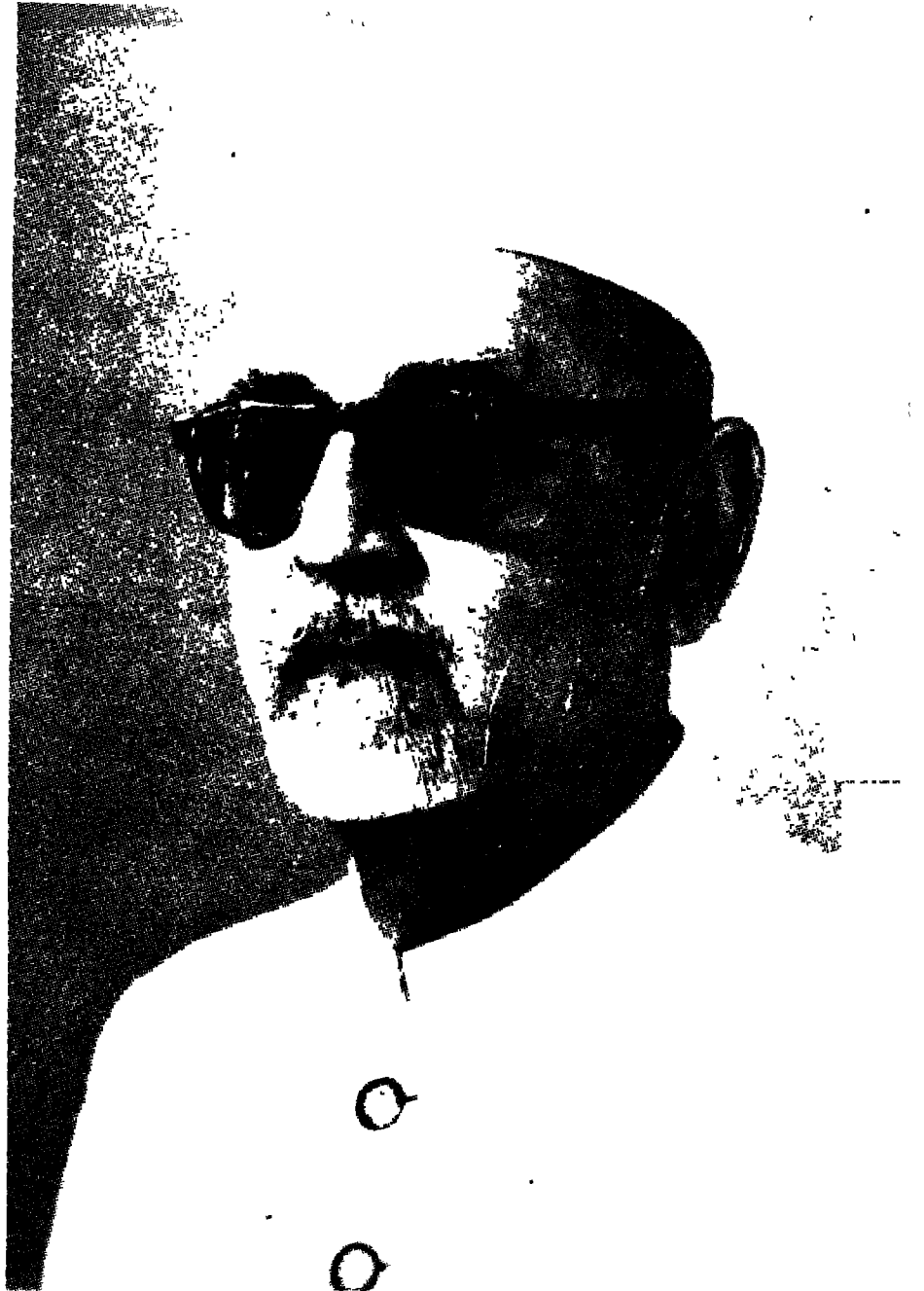
اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت

اُردو زبان و ادب کی کم سنی کو دیکھتے ہوئے اس میں طنز و مزاح کا سرمایہ خاصا وقیع ہے اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں، لیکن سب سے قوی سبب یہ ہے کہ اُردو اس وقت علمی اور کتابی زبان کی حیثیت سے نمودار ہوئی، جب ہند ایرانی تہذیب اپنے نقطۂ ارتقا کو پہنچ چکی تھی۔ طنز و مزاح کا تعلّق معاشرت کے مسائل سے ہے۔ جب تک انسان کا شعور اتنا بالغ نہ ہو کہ وہ نہ صرف گرد و پیش کی بے ہنگم باتوں پر ہنس سکے بلکہ خود اپنا بھی خاکہ اُڑا سکے اُس وقت تک وہ طنز و مزاح کی رُوح کو نہیں سمجھ سکتا۔ طنز یا مزاح بے معنی ہنسی کا نام نہیں ہے۔ یہ گہرے عرفانِ ذات یا معاشرہ کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔

اُردو زبان کی یہ خصوصیت کہ وہ مغلوں کے دورِ زوال میں پیدا ہوئی اُس کے لئے ایک اِفادیت کا پہلو بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُردو میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز ہونے سے پہلے ہی طنز و مزاح کی صنف وجود میں آ چکی تھی جس کی مثال میں جعفر زٹلی کا کلام پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں اُردو اور فارسی ترکیبوں کی مضحکہ خیز آمیزش یہ اشارہ کر رہی ہے کہ مقامی زبان فارسی سے اسلوب و ادا کے وسیلے چھین رہی ہے۔ جعفر کا اسلوب ہی مضحک نہیں ہے، اس نے اپنے دَور کی سیاست اور سماج پر بھی نشتر زنی کی ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جو اخلاقی انحطاط اور سیاسی زوال کی علامتیں اُبھر آئی تھیں اُن کے اثرات جعفر کی شاعری میں نمایاں طور سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ پھر جب فارسی گوئی کا رواج کم ہوا اور ہندی نژاد شاعروں کو اپنی مقامی زبان میں شعر کہنے کا احساس ہوا تو اُس کا آغاز بھی ایک ایسے اُسلوب سے ہوا جسے ہم کسی حد تک طنز و مزاح کے ذیل میں رکھ سکتے ہیں، یعنی ایہام گوئی۔ یہ لفظوں کی بازی گری تھی جس میں ایسے لفظ کا انتخاب کیا جاتا ہے جس کے دو معنی ہوں۔ ایک تو فوری طور پر ذہن میں آئے اور دوسرا ذرا اُوٹ میں رہے اور شاعر کا مقصود وہی معنیٔ بعید ہو۔ ایہام گوئی کی روش زیادہ عرصے تک نہ چل سکی اور خود ایہام گو شاعروں کو اُس کے فضول ہونے کا بہت جلد احساس ہو گیا تھا مگر اُس کے بعض فائدے یقیناً ہوئے۔ اوّل تو زبان کی وسعت اور امکانات میں اضافہ ہوا، دوسرے اُردو شاعری سے عوامی دلچسپی پیدا ہوئی۔ ایہام کے "دل کو کھینچنے" کا ثبوت میرؔ کی شاعری سے بھی ملتا ہے۔ آج بھی کسی ایہام گو شاعر مثلاً ناجیؔ یا آبروؔ کا دیوان اُٹھا کر پڑھئے تو وہ سنجیدہ شاعری کی نہیں بلکہ طنز و مزاح کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔

دَورِ ایہام گویاں کے بعد سرِ فہرست نام حاتمؔ، سوؔدا، میرؔ، میرؔ سوز وغیرہ کے آتے ہیں۔ حاتمؔ کے کلیات میں ایک ایسا نمونہ بھی ملتا ہے جسے ہم اُردو نثر میں مزاح کا قدیم ترین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک نثر پارہ ہے جس کا عنوان ہے "نسخۂ مفرح الضحکِ معتدل" اسے شاہ کمال نے "تذکرہ مجمع الانتخاب" میں بھی نقل کیا ہے۔ اردو نثر میں مزاح کا اس سے زیادہ قدیم نمونہ میری نظر سے نہیں گزرا اسلئے یہاں نقل کرتا ہوں:

"چاندنی کا روپ، دوپہر کی دھوپ، چُڑیل کی چوٹی، جھتنے کی لنگوٹی، پریوں کا گزر، دیو کی نظر، تیس تیس ٹکے بھر، کبوتر کی غٹرغوں، مرغی کی کُڑکُڑوں، چیل کی چِل چِل، کیڑوں کی کلبل، جُگالی شتر، بکرے کی میں، کوے کی ٹیں، آٹھ آٹھ رتی، ان سب دواؤں کو لے کر نہ رات ہو، نہ دن ہو، نہ صبح ہو نہ شام ہو، نہ باسی پانی نہ تازہ پانی، اُوس میں سُکھا کر گالے کی سِل پر ممی کی بٹّی سے پیسے، پھر مکڑی کے جالے کی صافی میں چھان کر فرشتے کے موت میں خشخش کے ساتویں حصے برابر گولی باندھے۔ وقت نزع کے لطخ کے دودھ سے ایک کفِ پا پھانکے کھانے پینے، سونے بیٹھنے، دیکھنے بولنے، سُننے سونگھنے سے پرہیز کرے۔ جب خوب بھوک لگے تو اسی نوّے پیزاروں سے زیادہ نہ کھائے۔ حاتمؔ کہے ایک روگ سے ستّر روگ پیدا کرے۔"

سوؔدا کے سامنے ہجو کا وسیع میدان تھا اور انہیں زبان و بیان پر قدرتِ کاملہ حاصل تھی۔ لہٰذا انہوں نے جہاں قصیدے لکھ کر انوری و خاقانی کا تتبع کیا ہے، وہیں فارسی کے ہجو گو شعرا کے نمونے کی ہجویات بھی لکھی ہیں۔ انہوں نے اکثر شخصیات ہی کو موردِ طعن بنایا ہے لیکن اُن کی بعض ہجویہ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں

اداریہ

یقین محکم، عمل پیہم، محبّت فاتح عالم

ادھر حال میں سارے ملک میں تشدّد کی ایک لہر دوڑی ہوئی تھی۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ غصّہ اور تخریبی جذبہ آج کل کی زندگی کے دباؤ کی وجہ سے ہے۔ قیمتیں بڑھتی جا رہی ہیں، روزگار نہیں ملتا۔ لہٰذا لوگ فطری طور پر مشتعل ہو کر توڑ پھوڑ کرتے ہیں اور اس طرح سماج کو بدلنے کے جذبے کا اظہار کرتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں کہ قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور روزگار کے مواقع کم ہیں، کیونکہ یہ وبا عالمگیر ہے۔ اس کا سبب ایک طرف تو پچھلی دو خراب فصلیں ہیں اور دوسری طرف خام تیل کی قیمت میں اضافہ۔ لیکن اس کا اثر کس پر پڑ رہا ہے؟ اگر آج غلّہ کی قیمت بڑھ رہی ہے تو ہندوستان کی نوّے فی صد آبادی کو جو دیہاتوں میں رہتی اور غلّہ اُگاتی ہے اس سے خوش ہونا چاہیئے اور صرف دس فیصدی آبادی کو جو شہروں میں رہتی ہے ناخوش ہونا چاہیئے۔ اسی طرح نوّے فی صد آبادی کو جو غلّہ اُگانے میں مشغول ہے زیادہ روزگار ملنا چاہیئے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ در اصل غلّہ اُگانے والوں میں سے صرف وہی خوش حال اور فارغ البال ہیں جن کے پاس بڑے بڑے فارم، ٹریکٹر، کیمیاوی کھاد، آبپاشی کے لئے پمپ اور غلّہ محفوظ رکھنے کے لئے گودام ہیں۔ باقی لوگ تو زیادہ تر اُن کے مزدور، ملازم یا دستگیر ہیں۔ لیکن تعجب اس پر ہے کہ فسادات غریب غربا نہیں کرتے ہیں بلکہ وہی بڑے لوگ جو تاجروں کے ساتھ مل کر غلّہ کو تہہ خانوں میں دبا دیتے ہیں اور چور بازاری کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے پچھلے سال گیہوں کے تھوک بیوپار کے قومیانے سے عدم تعاون کیا۔ لہٰذا دیہاتوں میں سچی خوشی اور خوش حالی لانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے زرعی اصلاح اور بے کھیت مزدوروں کو زمینیں دینا۔

شہر میں یہی مسئلہ دوسرے ڈھنگ سے پایا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ چند طبقے اور پارٹیاں جو پچھلے پچیس سال میں بار بار عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں، جمہوری اقدار سے بیزار اور مایوس ہو چکی ہیں اور اب وہ کسی بھی طریقے سے طاقت حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ یہ لوگ کون ہیں؟ وہی جو استحصال کی آمدنی پر پلتے ہیں، وہی جو بینکوں کے قومیانے کے خلاف تھے، وہی جنھوں نے صنعتی پیداوار کو بالکل ٹھپ کر رکھا ہے اور وہی جو گیہوں کی تجارت کو اپنے قبضہ سے نکلنے دینا نہ چاہتے تھے۔ تمام رجعت پسند اور متعصب پارٹیوں کو انھی لوگوں کی حمایت حاصل ہے کیونکہ یہ لوگ بقائے حال (STATUS QUO) کے حامی ہیں اور معاشرے میں کسی تبدیلی کے شدید مخالف۔ یہی لوگ وہ سرمایہ مہیا کرتے ہیں جس کی مدد سے ایک طرف تو نوجوانوں کو مشتعل کیا جاتا ہے اور دوسری طرف غنڈوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے کہ وہ امنِ عامّہ میں خلل ڈالیں۔

ان حالات میں حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ جلد از جلد زمینی اصلاحات کو عملی جامہ دے، اپنے شہریوں کی تکلیفات کا حتی الامکان ازالہ کرے اور ان تمام سماج دشمن عناصر کو جو ایک عام شہری کو اپنی روزی کمانے اور اپنی تعلیم اور دیگر جائز حقوق حاصل کرنے سے روکتے ہیں سخت سے سخت سزا دے۔ دوسری طرف شہریوں کو بھی یہ احساس ہونا چاہیے کہ انھوں نے بار بار سوچ سمجھ کر اپنی حکومت چُنی ہے۔ لہٰذا ان کا فریضہ ہے کہ وہ روزمرّہ کی زندگی میں پُرامن اور پُرسکون رہ کر نظم و ضبط اور تھوڑی مشقّت سہنے کا عادی ہو کر اور امدادِ باہمی کے ذریعے وقتی مشکلوں پر قابو پا کر اپنی حکومت کا ہاتھ مضبوط کریں۔ نوجوانوں کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیئے کہ توڑ پھوڑ کرنے، مشتعل ہونے، ٹرینیں روکنے، بسیں اور پوسٹ آفس جلانے، غلّہ لوٹنے اور ہڑتالوں سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ مسائل کا حل ہوتا ہے یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے، ایک کی جگہ دو دانہ گندم پیدا کرنے سے، محبّت و اُخوّت سے، قلّت کے زمانے میں اپنی روٹی بانٹ کر کھانے سے۔ آج نکسل وادیوں کو بنگالی تک بھول چلے ہیں لیکن تشدّد کی جگہ اہنسا، تخریب کی جگہ تعمیر سے کام لینے والے جواہر لال اور ذاکر حسین (جن کی برسی اسی مئی میں منائی جاتی ہے) گاندھی اور آزاد ہماری تاریخ میں امر ہو چکے ہیں۔

حیرت کی جا ہے کہ ہمارے عوام چناؤ کے دوران تو اپنے دوست اور دشمن کی پہچان کر لیتے ہیں لیکن فساد اور بلوے کے دوران وہ اپنے اصلی دشمنوں کو پہچان نہیں پاتے بلکہ اُنہیں کے بہکاوے میں آجاتے ہیں۔

یہ شمارہ

اس شمارے کے ساتھ "طنز و مزاح نمبر" ختم ہوا۔ صفحات کی قلّت کی وجہ سے ہر شاعر و ادیب کے رنگ کی ایک جھلک یا نمونہ ہی پیش کیا جا سکا۔ امید ہے کہ اس سے ادب کے رسیا لوگوں کو ان ادیبوں کا مزید کلام یا نگارشات پڑھنے کی تشویق ہوگی۔ اسی تنگ دامنی کی بنا پر بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات شامل نہ ہو سکیں جس کا ہمیں افسوس ہے لیکن جو کچھ سامنے ہے اس سے بھی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُردو ادب میں اعلیٰ پائے کا طنز و مزاح کثیر مقدار میں موجود ہے۔

جس میں جنسی اور شہوانی جذبات کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے اور ایسی علامتیں اور استعارے برتے گئے ہیں جنہیں ہماری مشرقی تہذیب میں "بدتہذیبی" سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح کی شاعری کے نمونے ابتدا میں جعفر زٹلی کے کلام میں بھی ملتے ہیں اور سودا، قائم، میر یا میر حسن کا کلیات بھی ان سے خالی نہیں ہے، مگر افسق، زانی یا چرکیں جیسے شعرا نے اسے مستقل موضوع اپنی فکری کاوشوں کا بنایا ہے اور اس کی روایت ہمارے عہد میں عریاں دہلوی یا رفیع احمد خاں لکھنوی تک آتی ہے۔ مگر یہ کلام بلاغت نظام زیادہ تر "سینہ بہ سینہ" ہی چلتا ہے اس لئے اس کے ادبی تاریخ میں در آنے کا کبھی امکان نہیں۔

اب ہم اس سرسری جائزے میں عہدِ غالب کے کنارے تک آ لگے ہیں۔ اب تک اُردو کا جو کچھ بھی سرمایۂ طنز و مزاح ہے وہ نظم کی مختلف اصناف میں ہے اور نثر میں اگر متفرق طور پر کچھ لکھا بھی گیا ہو تو وہ چنداں قابلِ التفات نہیں ہے۔ مگر مرزا غالب اس لحاظ سے بھی امتیاز رکھتے ہیں کہ اُن کے اردو خطوط کے اقتباسات کو ہم اردو نثر میں شگفتہ نگاری اور طنز و مزاح کے ادبی نمونے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ طنز و مزاح کے بہترین ادبی اظہار کا جو معیار سوچا جا سکتا ہے اُس پر غالب کی اُردو نثر کے نمونے ہی نہیں اُن کے بعض اشعار بھی پورے اُترتے ہیں۔ ان کے اُسلوب میں جامعیت، برجستگی اور شائستگی ایسے بُنیادی اوصاف ہیں جو طنز و مزاح کے لئے بھی ضروری شرائط میں سے ہیں، اس لئے غالب کی نثر کو یہ امتیاز ملا ہے کہ وہ بیک وقت بہترین اُسلوب کا نمونہ بھی ہے اور بہترین مکتوب نگاری کا بھی۔ اسی طرح اسے نثر میں طنز و مزاح کے نمونے کے طور پر بھی بے تکلف پیش کیا جا سکتا ہے

غالب کے بعد سرسیّد اور اُن کے رفقا نے اردو نثر کی سرپرستی کی اور اُن کی تحریروں میں شگفتہ نگاری کے بعض اچھے نمونے ملیں گے لیکن اُنہیں طنز و مزاح کی تاریخ سے مربوط کرنا دُور از کار بات ہوگی۔ البتہ بعض نثر نگار مثلاً ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں میں طنز و مزاح کا عُنصر مل جاتا ہے۔ سرسیّد کا مقصد اصلاح تھا اور اُن کے رفقا نے بھی یہ کوشش کی کہ طنز و مزاح سے ہٹ کر سنجیدہ نگاری اور علمی اظہار کے لئے اردو اسالیب کی تربیت کریں، اس لئے اُن کی تحریروں میں وہ شگفتگی نہیں ملے گی جو اُسے طنز کا یا مزاح کا شاہکار بنا دے۔ البتہ اس زمانے میں جن حضرات نے سرسیّد تحریک کی مخالفت پر کمر باندھی تھی اُن کی تحریروں میں پھبتی اور پھکڑ اور طنز کا عنصر زیادہ مل سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی "اودھ پنچ" کا دَور شروع ہو جاتا ہے۔ اُس وقت مغربی تہذیب کا سیلِ بے اماں اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ "اودھ پنچ" کے فن کاروں نے اُس پر بند باندھنے کی کوشش کی اور نظم و نثر میں ایسے لکھنے والوں کا ایک حلقہ پیدا کر دیا جو خالصتہً طنز و مزاح کے نمائندہ تھے۔ ورنہ اس دَور سے پہلے ہمیں بعض مزاح گو شعرا تو ملتے ہیں، نثر میں خالص مزاح نویس ادیب نہیں تھے۔ دوسرے "اودھ پنچ" نے اپنے عہد کی سیاست کو ہدف بنایا۔ اس سے عوام میں سیاسی بیداری کا سُراغ ملتا ہے۔ ہم انیسویں صدی کی سیاست اور معاشرت کے مسایل کو اُردو طنز و مزاح کے اس آئینے میں دیکھ سکتے ہیں جو "اودھ پنچ" نے پیش کیا تھا اور اس لحاظ سے پچھلے کسی زمانے کا اُردو ادب معاشرتی کیفیات کے اتنے واضح عکس پیش نہیں کرتا۔

اُردو طنز و مزاح کی کوئی تاریخ لکھی جائے، خواہ وہ مختصر ہو یا مُطوّل، اس میں "اودھ پنچ" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اجراء ۱۸۷۷ء میں ہوا اور یہ ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سجّاد حسین تھے جنھوں نے غدر سے ایک سال پہلے آنکھ کھولی تھی اور ۲۲ فروری ۱۹۱۵ء کو انتقال کر گئے۔ گویا انہوں نے جتنی زندگی پائی وہ حکومتِ برطانیہ کے استحکام اور ہندوستانی تمدّن کے مغربی اثرات سے مغلوب ہونے کے عمل کا مشاہدہ کرنے میں گزری۔ رہنے والے وہ اودھ کے تھے۔ اس لئے لامحالہ انگریزوں اور انگریزی تہذیب سے ایک طرح کی کَد ہونی ہی چاہیئے تھی کیونکہ انگریزوں نے جس طرح ملکِ اودھ پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا اُسے وہاں کے باشندے آسانی سے فراموش کرنے والے نہیں تھے۔

"اودھ پنچ" نے اپنے عروج کے زمانے میں ایسے لکھنے والے پیدا کر دیے تھے جن کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیّت حاصل ہوئی اور ان لکھنے والوں کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں نے "اودھ پنچ" کو ایک تحریک بنا دیا۔ اس کا ثبوت وہ اخبارات ہیں جو ہندوستان کے کونے کونے سے نکلنے شروع ہو گئے تھے، جیسے "پنجاب پنچ"، "لاہور پنچ"۔ "جالندھر پنچ"۔ "بنارس پنچ"۔ "آگرہ پنچ"۔ "دکن پنچ" وغیرہ۔ اور "اودھ پنچ" کے لکھنے والوں میں ایسے نام سامنے آئے جو خود طنز و مزاح کی تاریخ کا مستقل باب ہیں جیسے اکبر الٰہ آبادی۔ رتن ناتھ سرشار۔ تربھون ناتھ ہجر۔ سید محمد آزاد۔ مچھو بیگ ستم ظریف۔ احمد علی کسمنڈوی۔ احمد علی شوق۔ محفوظ علی بدایونی۔ جوالا پرشاد برق وغیرہ

اُس عہد کی سماجی ابتری اور نظامِ زندگی کی ناہمواری کا احساس ہوتا ہے "قصیدۂ تضحیکِ روزگار" "ہجوِ شیدی فولاد خاں کوتوال" یا "قصیدۂ شہر آشوب" سے مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ ان سے ہم یہ ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ سیاسی اور سماجی مسائل پر طنز کرنے کی جو ابتدا جعفر زٹلی نے کی تھی اُسے سودا نے آگے بڑھایا ہے۔ میر نے بھی ہجویں اور شہر آشوب لکھے۔ اسی طرح ہمیں عہدِ متوسط کے شعرا میں میر حسن قائم چاندپوری، بقا اکبرآبادی، انشا، مصحفی، جرأت اور نوا بدایونی کے کلام میں ہجویات کا عنصر ملے گا۔ ان میں بعض ہجویں جو ذاتی رنجش کے زیرِ اثر لکھی گئیں، رکیک ہیں۔ لیکن جہاں موضوع میں عمومیت پیدا ہوگئی ہے یا ہجو کا موضوع شخصیات نہیں ہیں وہاں طنز و مزاح کے اچھے نمونے بھی مل جاتے ہیں یہاں مثالوں کی جگہ صرف اشاروں پر اکتفا کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لئے ان شعرا کے دواوین سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ قائم چاندپوری نے بھی بہت رکیک ہجویں لکھی ہیں مگر اُن کی بعض بیانیہ مثنویاں جیسے "در ہجو موسم سرما" جو غلطی سے کلیاتِ سودا میں شامل ہوگئی ہے یا مثنوی "در ہجو برسات" عہدِ وسطیٰ کی اُردو شاعری میں طنز و مزاح کے اچھے نمونے ہیں۔ اردو شاعری کو فارسی زبان و ادب سے وراثت میں بہت کچھ ملا۔ تمام بحریں اور اوزان فارسی کے تھے۔ استعارے اور تشبیہات، تلمیحات اور محاورے، اسی طرح اصنافِ سخن مثلاً قصیدہ مرثیہ، مثنوی، قطعہ، رباعی وغیرہ یا موضوعات جیسے شہر آشوب، ہجو، اسی طرح رموز و علائم بھی فارسی ہی کے رائج ہوئے۔ ان میں کہیں کہیں اپنے ماحول کے مطابق ترمیم کر لی گئی ورنہ بجنسہٖ اپنائے گئے۔ مثلاً واعظ اور زاہد کا تمسخر، شیخ سے چھیڑ چھاڑ، محتسب کو ستانا وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی تسبیح و زنار، کعبہ و بتخانہ، مسجد و میکدہ بھی شاعرانہ علامتوں کے طور پر کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔

ایک اور روایت اردو شاعری کو مبالغہ آرائی کی ملی۔ قصیدہ میں ممدوح کی شجاعت، سخاوت اور مکارمِ اخلاق کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا تاکہ زورِ کلام پیدا ہو۔ وہاں یہ معیوب نہیں مستحسن، بلکہ ایک حد تک ضروری ہے۔ اس لئے کہ اگر مدح میں صرف "بیانِ واقعہ" پر اکتفا کیا جائے تو وہ مدح نہیں بلکہ "اخبارِ دربارِ معلیٰ" قسم کی چیز ہو جائے گی۔

ایک اور روایت جو ہمیں فارسی بلکہ عربی سے ملی ہے شاعروں کی معاصرانہ چشمک اور نوک جھونک ہے۔ عربی میں تو جریر اور فرزدق اور الاخطل کے "نقائض" (جھڑپیں) ایک پورا موضوع ادبی تاریخ کا ہے اور ان پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فارسی کے شعرا بھی اس میدان میں عربی والوں سے پیچھے نہیں رہے اور اس معاملہ خاص میں اُردو نے بھی فارسی کا "حقِ نمک" ادا کرنے میں کسر نہیں کی۔ چنانچہ اُردو شاعری کے آغاز ہی سے ہمیں شاعروں کی چشمکیں اور معرکے ملنے لگتے ہیں۔ شاہ مبارک آبرو اور میرزا مظہر، سودا اور ضاحک یا سودا اور فدوی، میر اور خاکسار، یا میر اور بقا، اسی طرح مصحفی اور انشا، اور ناسخ و آتش یا ذوق و غالب کے معرکے اردو شاعری کو بعض دلچسپ تخلیقات دے گئے ہیں۔ ان ہجویات میں جتنا حصہ ادبی لحاظ سے قابلِ اعتنا ہے وہ ہمارے طنز و مزاح کے سرمائے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان معرکوں میں سب سے زیادہ مواد مصحفی و انشا کی جھڑپوں کا محفوظ ہے اور اُسے تقریباً ہر تذکرے اور تاریخ میں نقل بھی کیا جاتا ہے اور ان کی روشنی میں انشا اور مصحفی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا موازنہ کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ معرکہ میں "جارحیت" کا مرتکب کون ہوا، زیادتی کس نے کی، اور کون بے قصور یا مظلوم ہے؟ یہ ہمارا فی الوقت موضوع نہیں، حالانکہ اس پہلو سے ابھی تک جن حضرات نے ان معرکوں کا جائزہ لیا ہے وہ اپنا رویہ منصفانہ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ دوسرا پہلو ان معرکوں کے مطالعہ کا یہ ہے کہ ہجویں کس کی کامیاب اور برجستہ ہیں تو اس میں شک نہیں کہ انشا کا پلّہ بھاری ہے۔ وہ طبعاً ہنسوڑ ہیں اور ان کا اسلوبِ غزل میں بھی ایسا ہے کہ وہ طنز و مزاح سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔

مصحفی اور انشا کے زمانے میں اُردو شاعری کا مرکز دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہوگیا اور وہاں کے درباری ماحول میں ایسے مضامین کو زیادہ فروغ حاصل ہوا جو سستی لذت اور انبساط پیدا کرنے والے ہوں۔ اس سے اُردو غزل کی علامتوں میں جو اضافے یا اُن کے معنی و مفہوم میں تبدیلیاں ہوئیں اُن سے ہماری طنز و مزاح کی تاریخ میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے اہم تبدیلی "ریختی" کا فروغ ہے۔ انشا اور رنگین دونوں ہی کو ریختی کی ایجاد کا دعوےٰ ہے اور بعض حضرات نے اس کا منبع دکن کی سرزمین میں تلاش کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ کچھ حضرات نے اس کے "ہندوستانی کیریکٹر" پر اس لحاظ سے زور دیا ہے کہ ہندی شاعری میں اظہارِ عشق عورت کی طرف سے ہوتا ہے اور مرد کی حیثیت محبوب کی ہوتی ہے لیکن ریختی کو ہندی شاعری سے دُور کی مماثلت بھی نہیں ہے۔ ہندی کی عشقیہ شاعری میں عورت کی زبان سے ایسے رکیک اور بیہودہ مضامین ادا نہیں کرائے جاتے جو ہمیں ریختی میں ملتے ہیں۔

ایک اور صنف جسے طنز و مزاح میں تو کیا رکھا جائے گا لیکن پھکڑ یا عریاں نویسی کے ذیل میں آتی ہے وہ شاعری ہے

جاوید کردار بھی دیا ہے لیکن اسی طوالت کی وجہ سے یہ عیب پیدا ہوگیا ہے کہ کچھ حوادث اور بوالعجبیاں تو خوجی سے سرزد ہوئی ہیں مگر اکثر مواقع پر حوادث کا فریم تیار کر کے اس میں خوجی کو فٹ کیا گیا ہے۔ اور یہ حال اردو کے دوسرے مستقل کرداروں کا بھی ہے۔ اسی طرح کا ایک کردار منشی سجاد حسین کے "حاجی بلغ العلیٰ" بھی ہیں۔ بعد کے دور میں علی عباس حسینی کے "حکیم بانا"، امتیاز علی تاج کے "چچا چھکن" اور شوکت تھانوی کے "قاضی جی" کا نام لیا جاسکتا ہے۔

"اودھ پنچ" کے کچھ لکھنے والے تو معروف ہیں اور ان کے مضامین یا نظمیں علیحدہ بھی کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں مگر بہت سے وہ اہلِ قلم بھی "اودھ پنچ" میں لکھتے رہے جو بہت بعد کو اپنی اصلی شکل وصورت میں سامنے آئے مثلاً مولوی محفوظ علی بدایونی نے کبھی اپنے اصلی نام سے نہیں لکھا۔ اسی طرح منشی سجاد حسین بھی فرضی ناموں سے لکھا کرتے تھے۔ مگر ایک گروہ "اودھ پنچی فن کاروں" کا ایسا بھی ہے جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ "اودھ پنچ" کا پرانا فائل دیکھنے والے بہت سا کلام نظم ونثر "لافر" یا "مولانا دکنی" یا "مولانا جنوبی" یا "مس چشتیہ" یا "مس سہروردیہ" یا ایسے ہی دوسرے فرضی ناموں سے ملے گا۔ ان مضامین کے اصل مصنف نے کبھی اپنے چہرے سے نقاب نہیں اٹھایا۔ یہ مولوی عبدالغفور شہباز شاگرد سید فضل ستار نقوی کا کلام ہے جو لاابالی تخلص کرتے تھے اور مختلف فرضی ناموں سے "اودھ پنچ" میں لکھا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک بار وہ لکھنؤ گئے اور منشی سجاد حسین سے ملے۔ انہوں نے اثنائے کلام میں "مسٹر لافر" اور "مسٹر لاابالی" وغیرہ کی اُن تخلیقات کو سراہا جو "اودھ پنچ" میں چھپتی رہتی تھیں۔ تب بھی انہوں نے یہ ظاہر نہ کیا کہ وہ ذاتِ شریف وہ خود ہی ہیں۔ اُن کے کلام نثر ونظم کا ایک انتخاب اب اشاعت کے لئے تیار ہو رہا ہے۔

"اودھ پنچ" کا دورِ اول ۱۹۱۲ء میں ختم ہوا۔ بعد کو اُسے ممتاز حسین عثمانی نے اسی نام سے پھر جاری کیا مگر وہ اہمیت اور خصوصیت جو دورِ اول کے "اودھ پنچ" کو حاصل تھی اُسے نصیب نہ ہوئی کیونکہ لکھنے والوں کی اہمیت کے ماسوا اُس صدی کے ابتدائی سیاسی و معاشرتی حالات کا واپس آنا بھی محال تھا اور "اودھ پنچ" کی ادبی خدمات اُسی وقت روشن ہوتی ہیں جب انہیں سیاسی وسماجی حالات کے سیاق وسباق میں دیکھا جائے۔

"اودھ پنچ" کے دور کے خاتمہ پر عہدِ جدید کا آغاز ہوتا ہے اور اس وقت ہمیں مہدی افادی۔ سلطان حیدر جوش۔ سجاد حیدر یلدرم۔ منشی پریم چند۔ علی عباس حسینی، قاضی عبدالغفار۔ ملا رموزی۔ خواجہ حسن نظامی۔ ظفر علی خاں۔ عبدالماجد دریا بادی۔ ابوالکلام آزاد۔ امتیاز علی تاج۔ عظیم بیگ چغتائی۔ فرحت اللہ بیگ۔ عبدالعزیز فلک پیما۔ اور عبدالمجید سالک جیسے لکھنے والے ملتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو مغربی ادب سے بھی شناسائی رکھتے تھے اس لئے ان کی تخلیقات میں نیا رنگ و آہنگ ملتا ہے۔ ان میں بیشتر وہ لکھنے والے ہیں جو بنیادی طور پر مزاح نگار نہیں ہیں بلکہ ان کی تحریروں میں "شگفتہ نگاری" کے نمونے ملتے ہیں۔ وہ لکھنے والے جنہوں نے طنز ومزاح ہی سے سروکار رکھا، ظفر علی خاں، ملا رموزی، عظیم بیگ چغتائی اور فرحت اللہ ہی ہیں۔ ان حضرات کے معاً بعد جو دور آتا ہے اُس میں سرفہرست نام رشید احمد صدیقی کا ہے۔ پھر پطرس بخاری، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، شوکت تھانوی، شفیق الرحمن، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی، غلام احمد فرقت، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، مشتاق احمد یوسفی، شفیع عقیل اور ابن انشاء وغیرہ۔ اِدھر نظم کے میدان میں "اودھ پنچ" کے بعد ریاض خیر آبادی کا "فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" اور "ریاض الاخبار" ہے۔ اور عہدِ جدید کے آغاز میں ظریف لکھنوی، احمق پھپھوندوی، جوش ملیح آبادی، شاد عارفی، سید محمد جعفری، سید ضمیر جعفری، مجید لاہوری، راجا مہدی علی خاں، سرور ڈنڈا، دلاور فگار، سلیمان خطیب، رئیس امروہوی، واہی نقوی اور شہباز امروہوی کا نام لیا جاسکتا ہے۔

اس جائزے میں طنز ومزاح کی تاریخ کا استقصاء یا انتقادی مطالعہ ممکن نہیں۔ نہ یہ مناسب ہوگا کہ عمومی طور پر ریمارک دیئے جائیں۔ اس لئے عہدِ جدید تک صرف بنیادی رجحانات کا ایک جائزہ لیا گیا ہے۔

اب ہم اردو ادب میں طنز ومزاح کے تمام سرمائے کو اور اس کے ادبی اسالیب کے ارتقا کو ذہن میں رکھ کر اس کا مختصر تجزیہ موضوع اور معیار کے اعتبار سے کریں گے۔ یعنی ایک تو اس کی مختلف اصناف اور ہیئتیں جو اس تمام ارتقا کے دوران سامنے آئیں۔ دوسرے اس کے موضوع اور ان دونوں کے مجموعی تعلق سے اسالیب۔

یہاں ایک نکتے کی وضاحت کر دینا بہت ضروری ہے، اگرچہ یہ وضاحت بالکل آغاز میں ہونی چاہیے تھی۔ طنز اور مزاح کے الفاظ عموماً ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں لیکن ان دونوں کے مفہوم ومقصود اور اظہار واسلوب میں گہرا فرق ہے۔ یہ قطعاً ممکن ہے کہ کسی ادب پارے میں طنز ہو مزاح نہ ہو، یا بالعکس،

"اودھ پنچ" کی خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ اُس نے اُردو صحافت میں بعض نئی باتوں کو روشناس کرایا ہے ۔ مثلاً اُس سے پہلے کارٹون چھاپنے کا رواج نہیں تھا۔ اودھ پنچ کے کارٹون سیاسی مسائل پر بھی ہوتے تھے ۔ دوسرے بعض پرانی چیزوں کو اس اخبار میں نئے انداز سے پیش کیا گیا جیسے "ال نامہ" جو فارسی میں عبید زاکانی اور ملّا دوپیازہ سے بھی منسوب ہے اور ایسی ہی ایک تحریر کلّیاتِ جعفر زٹلی میں بھی ملتی ہے ۔ اس میں معروف الفاظ یا اصطلاحات کے آغاز میں الف لام اضافہ کرکے اُس کے نئے اور مزاحیہ انداز کے معنی لکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو کہاوت کا درجہ اختیار کر گئے ہیں: "الفیل اوّلِ مشقِ یزداں" "الفربہ۔ خواہ مخواہ مردِ معقول" وغیرہ ۔ "اودھ پنچ" میں سید محمد آزاد نے ایسے الفاظ مثلاً "پالسی" "سولیزیشن" "پارلیمنٹ" وغیرہ کی ایسی ہی مزاحیہ تشریحات کرکے در پردہ انگریزوں کی حکومت اور پالسی اور مغربی تہذیب پر کاری چوٹیں لگائی ہیں اور یہ طرز بعد کو بھی خاصا مقبول رہا۔

"اودھ پنچ" کی شہرت اُن قلمی ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے بھی ہوئی جو اُس نے اپنے زمانے کے مشہور لکھنے والوں کے مقابلے میں شروع کی تھیں۔ اُس کا پہلا ہدف تو مولانا الطاف حسین حالی تھے جنہوں نے "مقدمۂ شعر و شاعری" لکھ کر لکھنؤ اسکول کے حامیوں کو برہم کر دیا تھا۔ "اودھ پنچ" نے ایک عرصے تک حالی کو اپنے تمسخر اور استہزا کا نشانہ بنائے رکھا۔ مگر مولانا حالی نیک نفس اور مرنج و مرنجاں انسان تھے ۔ انہوں نے تمام وار سہہ لئے۔ اگر وہ بھی اپنے شاگردوں اور حامیوں کی ٹولی کو ساتھ لے کر میدانِ کارزار میں اُتر پڑتے تو ادبی تاریخوں میں "پانی پت کی چوتھی لڑائی" کا حال بھی لکھا جاتا۔ دوسرا ادبی معرکہ چکبست و شرر کے مابین "مثنوی گلزارِ نسیم" پر ہوا اور یہ اس لئے طول پکڑ گیا کہ فریقین میں سے کوئی بھی نچلا بیٹھنے کو آمادہ نہ تھا۔ اس معرکہ کی کاروائی کتابی صورت میں چھپ چکی ہے ۔

"اودھ پنچ" نے جس انداز کی مزاحیہ صحافت اُردو میں رائج کی وہ یوں بھی قابلِ قدر ہے کہ اُس سے پہلے اس انداز کا اور کوئی اخبار اُردو میں موجود نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بقولِ چکبست "اس کی ظرافت کا معیار کچھ بہت اعلیٰ نہیں تھا" اور کہیں کہیں پھکڑ بھی طبعِ سلیم پر گراں گزرتا ہے ۔ اُس کا خاص انداز پھبتی، ضلع جگت اور طنز و تعریض کا ہے۔ وہ شائستگی اور انبساط سامانی مفقود ہے جس کی ہم اعلیٰ درجہ کے مزاحیہ ادب سے توقع کرتے ہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اُس دَور کے حالات ہی اس طرح کے معیارِ مذاق کا مطالبہ کر رہے تھے ۔ ہاں یہ شکوہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ اُس کا اثر لکھنؤ کے اسلوب پر بہت زمانے تک رہا اور کسی حد تک آج بھی موجود ہے ۔

کچھ نقادوں نے "اودھ پنچ" کا موازنہ انگریزی کے مشہور اخبار (LONDON PUNCH) سے کیا ہے یہ بہ تکلّف ہی ممکن ہو سکتا ہے اس لئے کہ اودھ پنچ اور (LONDON PUNCH) کے ماحول اور سیاسی و سماجی حالات میں بھی فرق تھا اور دونوں کے قاریوں کی سطح ادراک اور سماجی شعور میں بھی۔ البتہ "اودھ پنچ" کا ایک کارنامہ اُسے اُردو طنز و مزاح کی تاریخ میں زندہ رکھے گا کہ اس نے ایک تہذیبی بحران کے زمانے میں لوگوں کو ہنسایا اور لکھنے والوں کی ایک پوری جماعت ایسی تیار کر دی جس کا اثر اُردو نثر کے اسالیب پر آج تک باقی ہے۔ ان لکھنے والوں میں اکبر الہ آبادی نظم میں اور رتن ناتھ سرشار نثر میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ۔

اکبر الہ آبادی طنز و مزاح میں اپنا منفرد اسلوب رکھتے ہیں اور اُن کی تقلید ابھی تک کسی سے ممکن نہیں ہو سکی ۔ انہوں نے مشرقی تہذیب کی برتری اور مغربی تمدن کی اُس روش پر تنقید کو اپنا موضوع بنایا جو ہم مشرقیوں کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی۔ اکبر کے عہد میں مغربی تعلیم و تہذیب کا سکّہ پوری طرح رائج ہو چکا تھا اور مشرقی تصوّرات کی حرمت و اہمیت کم ہو رہی تھی ۔ انہوں نے مغرب کو اپنے مطاعن کا ہدف بنا کر تمام مشرق کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا ۔ اس سے بحث نہیں کہ اکبر کے تصوّرات صحیح تھے یا نہیں لیکن اپنی روایات کو خود اپنے پاؤں سے ٹھکرا دینا اور کسی غیر ملکی تہذیب کے تسلّط کو بغیر احتجاج کے قبول کر لینا بھی کوئی غیرت مندی کا ثبوت نہ ہوتا، اس لئے اکبر نے اُس زمانے میں جو کچھ لکھا وہ انہیں لکھنا ہی چاہیئے تھا ۔

رتن ناتھ سرشار کی تمام تر شہرت اب اُن کے کلاسیکی شاہکار "فسانۂ آزاد" کی وجہ سے ہے ۔ اس میں انہوں نے لکھنؤ کے تمدّن کی عکاسی بہت خوبصورتی اور جُزرسی کے ساتھ کی ہے۔ فسانۂ آزاد کا بغور مطالعہ کرنے والا اُس عہد کے تمدّن کی جھلکیاں "فسانۂ آزاد" میں جتنی واضح دیکھے گا اُتنی اُسے کسی تاریخ کی کتاب میں نہیں ملیں گی۔ سرشار کا اسلوب ادبیت سے خالی نہیں اور اس میں لکھنؤ اسکول کی تمام خصوصیات بیک وقت مل جاتی ہیں ۔ پھر بھی "فسانۂ آزاد" کا عیب اُس کی طوالت ہے ۔ انہوں نے اُردو ادب کو "خوجی" کا زندۂ

سید احمد خاں (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء)

بحث و تکرار

جب کُتّے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گنجیلی آواز اُن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کُھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چِر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عف عف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اِس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اُسکی ٹانگ اِس کی کمر میں۔ اِس کا کان اُس کے منہ میں اور اُس کا ٹینٹوا اِس کے جبڑے میں۔ اِس نے اُس کو کاٹا اور اُس نے اِس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا۔ جو کمزور ہوا دُم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رُخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراونی ہو جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکت کرنے لگتے ہیں۔ نحیف نحیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اِس کی گردن اُسکے ہاتھ اور اُس کی داڑھی اِس کی مٹھی میں۔ لپّا ڈُگّی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غُرّاتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا اور ایک اُدھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقّی ہوتی ہے اُسی قدر اِس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غُرفش ہو کر رہ جاتی ہے کہیں توں تکار تک نوبت آ جاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے، مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتّوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتّوں کی سی بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے . . .

اسد اللہ خاں غالب (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء)

خط بنام علاء الدّین خاں

میری جان

بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ اِدھر متھرا داس سے قرض لیا اُدھر دربای مل کو مارا۔ اِدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر اک کے پاس تمسّکِ مُہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو۔ نہ مُول نہ سُود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے آگرے سے بھیجدیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کُل کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختارِ کار سُود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مُول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جُدا، بی بی جُدا، شاگرد پیشہ جُدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا گزارا مشکل ہو گیا۔ روزمرّہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش۔ صبح کو تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کو شراب و گلاب موقوف، بیس بائیس روپیہ مہینہ، بچا۔ روزمرّہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا۔ تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا۔ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گذرا تھا کہ رام پور سے وجہ مقرّری اور روپیہ آ گیا۔ قرضِ مقسّط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا۔ خیر ہو صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپھی کہتی ہیں ہائے دبی ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمّت کرے تو کیوں کر کرے۔ مینہ کُھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمّت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالانِ زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائیگی۔ مرمّت ہو جائیگی۔ پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں۔ ایک مرمّت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔

غالب۔ صبح یکشنبہ ۲۸ جولائی ۱۸۹۲ء

اور دونوں صفات کا اجتماع بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے بہت سے ادیب یا شاعر ایسے ہیں جنہیں یا تو صرف مزاح نگار ہی کہا جا سکتا ہے یا طنز نگار، ایسا بہت کم ہوگا کہ ایک ہی شخصیت ان دونوں کی جامع ہو۔ پھر طنز و مزاح کی قسمیں بھی بے شمار ہیں۔ طنز، تعریض، ہجو، تنقیص، تمسخر، استہزا، پھکڑ، پھبتی، شوخی، شگفتگی، ظرافت، تضحیک، ان سب لفظوں کے علیحدہ علیحدہ معنوں میں فرق (SHADES) ہیں اور اُن میں ایک طرف اعلیٰ درجہ کی ذہانت برجستگی اور نکتہ رسی کے مظاہر ملیں گے جنہیں بہترین تہذیبی شعور سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے تو دوسری طرف پست اندیشی، سستی لذّت، سوقیانہ اور مبتذل فکر کے جلوے بھی نظر آئیں گے جنہیں کچھ بھی کہا جائے "ادب" کہنا مشکل ہوگا۔ ہم نے ایسے نازک فرق کو ذہن میں رکھا ہے مگر یہاں اُس کی تفصیل یا تحلیل کو ضروری نہیں سمجھا۔ دوسری بات یہ ملحوظ رہے کہ جتنے بھی مجرّد تصورات ہیں یا فنونِ لطیفہ کے مظاہر ہیں اُن کی قطعی اور حتمی تعریف ممکن نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ بتانا آسان نہیں ہے کہ شعر کیا ہوتا ہے؟ اُسلوب کسے کہتے ہیں؟ قنوطیت کیا ہے؟ یا طنز اور مزاح میں کیا فرق ہے؟ ہم زیادہ سے زیادہ اس کی کچھ وضاحت کر سکتے ہیں، یا یہ بتا سکتے ہیں کہ انہیں کیا سمجھا گیا ہے۔ لیکن نظری سطح پر ایسی جامع "تعریف" کر دینا جس سے عملی تنقید یا منطقی نتائج کا استنباط ریاضی کے کُلیّوں کی طرح میکانکی ہو جائے، ممکن نہیں۔

اُردو میں طنز و ظرافت کے اوّلین نمونے نظم میں ملتے ہیں۔ اُن میں ہجو، ہزل اور تحریف سے زیادہ تر رنگِ مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ شہر آشوب مزاح سے زیادہ سماجی عوامل پر طنز کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور ان میں مزاحیہ شاعری کی نسبت سے تہذیبی اور معاشرتی شعور کی بھی فراوانی ہے۔ ریختی کو ہم ہزل ہی کی ایک شاخ سمجھ سکتے ہیں۔

نثر میں کردار نگاری اور خاکہ نگاری کے ابتدائی نمونے طنز و مزاح کی مثال ہیں مگر "اودھ پنچ" کے زمانے سے سیاسی اور سماجی اور تہذیبی مسائل کو طنز و مزاح کا موضوع بنایا گیا اور زمانۂ مابعد میں جو نثری نمونے طنز و مزاح کے ملتے ہیں اُن کا آب و رنگ سیاست کی نیرنگیوں ہی کا مرہونِ منت ہے۔

بیسویں صدی کے ساتھ ایک اور روایت اخبارات میں "مزاحیہ کالم" لکھنے کی شروع ہوئی ہے۔ غالباً مولانا محمد علی جوہر کے "ہمدرد" میں پہلی بار مزاحیہ کالم کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا عبدالمجید سالک (انقلاب) مولانا عبدالماجد دریا بادی (سچ اور صدق) چراغ حسن حسرت (شیرازہ اور امروز) مجید لاہوری (نمکداں) اور فکر تونسوی (ملاپ) اپنے طنزیہ و مزاحیہ کالم کے لئے عام طور پر متعارف ہیں۔ لیکن اخباری مضامین کے ادبی معیار کا ایک سطح پر قائم رکھنا مشکل ہی ہوتا ہے اور اخبار کی زندگی بھی ایک دو دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ان کالموں کا اگر انتخاب کیا جائے تو یقیناً ان میں بعض جواہر پارے بھی بکھرے ہوئے ملیں گے۔

اسی صدی میں ایک روایت بعض اخباروں نے کسی موضوع پر ایک مزاحیہ قطعہ چھاپنے کی بھی قائم کی ہے۔ چنانچہ اخبار "جنگ" میں رئیس امروہوی تقریباً ۲۷ سال سے روزانہ ایک مزاحیہ قطعہ لکھ رہے ہیں اور اب انہوں نے پچھلے پچیس سال کے قطعات پر مشتمل ایک مجموعہ تاریخی ترتیب کے ساتھ دو جلدوں میں چھاپا ہے جس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس چوتھائی صدی کا کوئی اہم تاریخی یا سیاسی واقعہ اُن کی نشتر زنی سے بچ نہیں سکا ہے۔

مزاحیہ ناولوں کا سلسلہ بھی اسی دَور کی پیداوار ہے۔ ابتدائی ناول معاشرتی اصلاح ہی کے مقصد سے لکھے گئے اور تفریح کے لیے داستانیں تھیں مگر اُن میں بعض ایسے بوالعجب کردار پیش کئے گئے ہیں جو کچھ دیر کے لئے قاری کی توجّہ اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اُسے قصّے کی طوالت کو انگیز کرنے کا حوصلہ بخش دیتے ہیں لیکن دورِ حاضر کے مزاحیہ ناولوں میں واقعات سے مزاح کم اور کرداروں کی بوالعجبیوں سے ہی زیادہ پیش کیا گیا ہے۔ مثال میں کرشن چندر کی کتاب "ایک گدھے کی سرگزشت" کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ایک بات خاص طور پر حیرت انگیز ہے کہ اس دور میں طنز و مزاح کے موضوعات میں وسعت اور تنوّع نہیں ملتا۔ صرف کوئی سیاسی ناانصافی یا بدعنوانی ہی طنز کا بہترین ہدف نہیں ہوتی۔ اس زمانے میں اخلاقی اور معاشرتی سطح پر جو بے یقینی اور تشکیک کا غلبہ ہے یا نظریات و تصوّرات کی باہم آویزش ہے اُس کا عکس ہمارے مزاح نگاروں کی تحریروں میں کم ہی ملتا ہے۔ شاید یہ سبب ہو کہ طنز و مزاح کو سماجی بیماریوں کا علاج نہیں بلکہ محض "تفریحِ طبع" کا آلہ سمجھ لیا گیا ہے۔

اسلوب و ادا کے اعتبار سے بھی جدید دَور کا طنزیہ و مزاحیہ ادب اُس برجستگی اور شائستگی کے معیار کو برقرار نہیں رکھ سکا ہے جو رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری اور کنہیا لال کپور نے قائم کیا۔ ●●

رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ء تا ۱۹۰۲ء)

خواجہ بدیع الزّماں عرف خوجی

اب سنئے کہ اِدھر خواجہ صاحب اُدھر بونا پہلوان دونوں کندے تول تول کر رہ جاتے تھے ۔ خواجہ صاحب نے گھونسا تانا ۔ بونے نے منہ چڑھایا یہ جھپٹے اُس نے گدّا مارنے کا قصد کیا۔ خوجی نے جھلّا کر چپت جمائی۔ بونے نے دھول لگائی۔ اور لطف یہ کہ دونوں کی چاندگھٹی گھٹائی چکنی اس زور کی آواز آتی تھی کہ سننے والوں اور دیکھنے والوں کا جی خوش ہوجاتا تھا۔

خوجی بولے " دیکھیے تو دم کے دم میں بیدم کئے دیتا ہوں کہ نہیں ؟"

آزاد بولے " مگر یار اس کا قد تو بہت ہی پست ہے ۔"

" ہائے افسوس " خوجی نے جواب دیا " بھئی تم ابھی بالکل ناتجربہ کار ہو۔ واللہ جو ذرا بھی تجربہ ہو، بس اور تو کیا کہوں۔ ارے کمبخت اس کا قد چور ہے جس طرح میرا بدن چور ہے یوں دیکھنے میں تو کچھ نہیں معلوم ہوتا مگر اکھاڑے میں چٹ اور لنگوٹ باندھ کے کھڑا ہوں بس دیکھیے بدن کی کیا کیفیت ہوتی ہے ۔ نہ بہ تہ بالکل گینڈا بنا ہوا، کوئی کہتا دُم کٹا بھینسا ہے ۔ کوئی کہتا ہے کہ ہاتھی کا پاٹھا ہے ۔ کوئی کہتا ہے ناگوری بیل ہے کوئی کہتا ہے جمنا پاری بکرا ہے اور میں اِدھر اُدھر شانے کو دیکھتا بر رجاتا ہوں ۔ کوئی دو جوتے بھی مارے تو کچھ پروا نہیں ۔ تو وجہ کیا؟ وجہ یہ کہ مستغنی ہوں یہ جانتا ہوں کہ کوئی بولا اور میں نے اٹھا کر دے مارا ۔ ذرا غصہ آیا، انجر پنجر الگ کر دیئے ۔ بھئی طاقت کا بھی کیا کہنا ۔"

خواجہ صاحب نے کئی بار جھلّا جھلّا کر چپتیں لگائیں۔ ایک بار اتفاق سے اُس کے ہاتھ میں اِن کی گردن آگئی اور اس زور سے گردن پکڑی کہ خواجہ صاحب سے چھڑائے نہ چھوٹی ۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے ، بہت کچھ زور لگائے مگر اس نے دونوں ہاتھوں سے گردن پکڑلی اور لٹک گیا تو خوجی کسی قدر جھکے۔ ان کا جھکنا تھا کہ اس نے اور بھی زور سے ٹمکّا دیا تو مُنھ کے بل زمین پر۔ دو تین لپّڑ صحیح کر کے بونا بھاگا اور خواجہ صاحب اسکی دُم کے ساتھ۔ اس نے جاتے کے ساتھ ہی دروازہ بند کر لیا ۔ خواجہ صاحب نے پٹخنی کھائی تو تماشائیوں نے قہقہہ لگایا۔ بس اُن کے غصّے کی کچھ نہ پوچھیے آسمان سر پر اٹھا لیا " او گیدی بودے بزدل ۔ گیدی اگر شریف زادہ ہے تو آجا مقابلے پر گیدی ۔ زمین پر گرا تو بھاگ کھڑا ہوا ۔"

آزاد نے بناوٹ کی راہ سے کہا " ارے میاں آخر یہ کیا ہوا، کون گرا؟ کون جیتا؟ ہم تو اُس طرف دیکھ رہے تھے ۔ معلوم نہیں کیا ہوا کس نے دے مارا "

خوجی اکڑ کر بولے " ایسی بات آپ کاہے کو دیکھنے لگے تھے ۔ انجر پنجر ڈھیلے کر دیے گیدی کے مگر اس کا قد چور ہے ۔ دیکھنے میں بونا ہے ۔ مگر باون گز سے کم اس کا قد نہیں ہے ۔ واللہ کشتی دیکھنے کے قابل تھی میں نے ایک نیا پیچ کیا تھا۔ آج بھی چاروں شانے چت گرا اور اس کے گرنے کے وقت ایسی آواز آئی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑ پھٹ پڑا۔ آپ نے سنا بھی ہوگا ۔"

آزاد نے پوچھا " وہ ہے کہاں ؟ کیا کھود کے زمین میں دفنا دیا آپ نے ؟"

" نہیں مردم آزاری سے منزلوں دُور بھاگتا ہوں اور قسم ہے ۔ واللہ پورا زور نہیں کیا۔ ورنہ کیا میرے مقابلے میں ٹھہرتا ۔ توبہ توبہ۔ ہاتھ پاؤں توڑ کے چرمر کر ڈالتا۔ میں وہ جن ہوں گرتے ہی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور خم ٹھونک کے سرخرو اُٹھ کھڑا ہوا۔ نانی ہی تو مرگئی مردک کی ع کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ خون خشک ہوگیا ۔ پس روتا ہوا بھاگا ۔"

" مگر خواجہ صاحب گرا تو وہ اور آپ کی پشت پر گرد کیوں اتنی لگی ہے اس کا کیا سبب ہے ؟"

" سچ کہوں اس مرتبہ میں اپنے زعم میں آپ آرہا اور پورا زور بھی تو نہیں کیا میں نے ورنہ لاش پھڑکتی ہوتی اور اب بھی ع

چور جاتے رہے کہ اندھیاری "

مس میڈ نے کہا کہ " بڑے شرم کی بات ہے ۔ ذرا سا بونا نہ گرایا گیا ان سے ۔"

خوجی نے سرپیٹ جواب دیا " جی چاہتا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹوں۔ بس اور کچھ نہیں۔ غضب خدا کا کہتا جاتا ہوں کہ اس گیدی کا قد چور ہے آخر میرا بدن چور ہے یا نہیں۔ اس وقت میرے تن پر انگرکھا یا دگلا کچھ نہیں ہے ۔ اس وقت ذرا میرے ڈنڈ دیکھیے گا اور ابھی کپڑے پہن لوں تو پدّی معلوم ہونے لگوں ۔ جیسے چھپتا بٹیر۔ بس یہی فرق سمجھو۔ اگر آزاد داد نہ دیں گے تو رنج ہوجائے گا۔ اول تو میں گرا نہیں اس نے مجھے نہیں پچھاڑا۔ اپنا لنگر میں اپنے آپ نہ اٹھا سکا۔ اپنے زعم میں آپ ہارا۔ دوسرے اس کا قد چور ہے۔ باون گز زمین میں اس کا دھڑ رہتا ہے۔ لنکا کی فوج کا ہے چھوٹے سے چھوٹا وہاں باون گز کا ہوتا ہے ۔"

خوجی مسکرا کر بولے " کیا کہا دُبلے ہاتھ پاؤں ! یہ ہاتھ پاؤں دُبلے پتلے نہیں ہیں ۔ مگر بدن چور ہے۔ یہ بھی اللہ کی دین ہے ۔ دیکھنے میں معلوم ہوتا ہے مرا ہوا آدمی ہے۔ مگر کپڑے اُتارے اور دیو معلوم ہونے لگا ۔ اسی طرح میرے قد کا بھی حال ہے کہ گنوار آدمی دیکھے تو کہے پستہ قد ہے مگر اس فن کے مُبصّر خوب جانتے ہیں کہ میں کس درجہ کشیدہ قامت آدمی ہوں اور روم میں، مجھے کہتے ہوئے ہنسی آتی ہے ، روم میں دو ایک گنواروں نے مجھے بھی بونا کہا تو بے اختیار ہنسی آگئی ۔ یہ خدا کی دین ہے کہ ہوں تو دراز قد۔ بالا بلند۔ مگر کوئی کلجگ کی کھونٹی کہتا ہے ۔ کوئی بونا بتاتا ہے ہوں موٹا تازہ سنڈا

باقی صفحہ ۱۴ پر

منشی سجّاد حسین (۱۸۵۶ء تا ۱۹۱۵ء)

انڈے بچّے والی چیل چلہار

بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جانِ تازہ پھونکنے، چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی 'اینٹی' صاحبہ چُپ شاہ کی بالکی، نَموہی بنی منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی توبہ کیجئے۔ بولیں اور بیچ کھیت بولیں۔ اس طرح بولیں جیسے ارہر کے کھیت میں پھندیت بٹیر، بلکہ گلا پھاڑ کے، غل مچا کے، سارا شہر سر پر اُٹھا کے، جس میں یہاں سے لندن تک تو خبر ہو جائے کہ لکھنؤ میں بھی کچھ 'اینٹی' بھائی ہیں۔ چنانچہ یوں تو عرصہ سے سٹر پٹر جلسے کرتے تھے اور بعض حضرات اپنے نزدیک حق ادا کرتے تھے یا مستحق بننے کی کوشش کرتے تھے، مگر جب دیکھا کہ کانگریس کا اجلاس سر پر ہی آ پہنچا، اِدھر لیفٹیننٹ گورنر بہادر بھی شہر میں تشریف فرما ہیں، اُدھر حضور وائسرائے بھی دربار فرمانے والے ہیں، چھتری سرکس بھی تماشے دکھا رہا ہے، الفریڈ کمپنی بھی تماشے کرنے آئی ہے، ان حضرات کو مثلِ عارضۂ متعدی بیخ بیخ چھوٹی، بے چینی بڑھی، مادّہ ہیجان میں آ ہی گیا اور ایک بار آنکھیں بند کر کے کچ کچا کے عظیم الشان "اینٹی کانگریس" کا اشتہار دے ہی دیا۔ کس کی رہی اور کس کی رہ جائے گی۔ وقت گذرتا جاتا ہے، بات رہ جاتی ہے۔ خلاصۂ اشتہار ملاحظہ ہو:

"منجانب مسلمانانِ شہر لکھنؤ۔ تاریخ ۳ر نومبر ۱۸۹۹ء بمقام بلند باغ، کانگریس کا جلسہ سالانہ لکھنؤ میں ہونے والا ہے۔ اس میں کچھ تجویزیں قرار دی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ وہ کُل باشندگانِ شہر کی ہیں . . . . حالانکہ اس شہر کے قریب قریب کُل باشندے چہ ہندو چہ مسلمان ابتدا ہی سے کانگریس کی مخالفت کرتے ہیں لہٰذا تدارک ہم پر لازم ہے جس کے لئے ایک بڑا جلسہ منجانب مسلمانانِ لکھنؤ، بتاریخ مذکور نو بجے اتوار کے دن، مکان انجمن رفاہِ عام قرار دیا گیا ہے لہٰذا استدعا ہے کہ وقتِ مقرّرہ پر تمام حضراتِ اہلِ اسلام اس جلسے میں مع اعزا و اقربا و احباب و متعلّقین کے شرکت فرمائیں اور گورنمنٹ کے خیر خواہ بنیں۔"

یوں تو اشتہار میں کئی باتیں ایسی ہیں جن میں اکثر . . گفتگو ہے مگر ایک بات اس نیاز مند کو طرفین سے یہ پوچھنا ہے کہ متعلّقین کو جو تکلیف دی گئی ہے۔ اِس کا انتظام کیا فرمایا گیا ہے کیونکہ اپنے "اینٹی" بھائیوں سے کچھ بعید نہ سمجھئے کہ کنجڑوں کی طرح مع متعلّقین جلسے میں آموجود ہوں۔ کیا معنی جب اعزا و اقربا و احباب کے علاوہ متعلّقین کو بھی یاد آپ نے فرمایا ہے اور یہ بھی غالباً "المشتہر" یعنی خان بہادر نظیر حسین خاں صاحب کلیم، نواب اعظن صاحب، مرزا عباس علی خاں صاحب، سکریٹری، حکیم محمد رضا خاں بہادر، شیخ علی عبّاس صاحب جانتے ہوں گے کہ متعلّقین بھی گھر سی، یعنی گھر کے لوگوں، یعنی لڑکے کی والدہ یعنی لڑکے کی والدہ یعنی اے جی یعنی بیگم، خانم صاحبہ، یعنی جورو جی یعنی زوجۂ معظمہ اطال اللہ پائنچا و آنچل و دوپٹہ ہا، علی روس شوہر الی یوم الوفات، بل بعد الممات کو کہتے ہیں، تو اُن ذاتِ شریف کے اُٹھ کھڑے ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔ جس طرح تھیٹر، سرکس، گھوڑ دوڑ کے جلسوں میں اکثر اتفاق ہوتا ہے، اُسی طرح یہاں بھی آدھمکیں کی اور یہ بھی نہ سمجھئے کہ جب سارا گھر یوں شریک ہوگا کہ اس دن ضرورت کا سامان بھی ہمراہ نہ ہوگا۔ خواصیں، پیش خدمتیں، شیر خوار بچہ جس کے ابھی ٹیکہ لگا ہوگا اور دانہ اُبھرنے یا دانت نکلنے کی وجہ سے چڑچڑا ہوگا۔ پھر اس کا گہوارہ، پالنا، جھنجھنا، چُسنی، انّا، چھوچھو، برادرِ رضاعی، اس کے علاوہ بکری کا بچّہ، چند خرگوش اور چینی چوہے، طوطے کا پنجرہ، جو ریز کم کرتا ہے اور خاص مصلحت سے آئے گا کہ بولنے والے کی بولیاں یاد کرلے، باورچی خانے کا بگلا، انّا کے صاحبزادے، نطفۂ ناتحقیق کا پالا ہوا، لینڈی کتّے کا پلاّ، چھوٹی صاحبزادی کا گلہری کا بچّہ، بائی گربہ خانم مسماۃ پسّی، کبوتروں کی کابک، مرغی کا ٹاپہ، بٹیروں کے تھیلے، بیگم صاحبہ کا پاندان یعنی سب کچھ دان، آفتابہ، آئینہ، اُگالدان، طشت، تسلہ، لوٹا، ڈھولک، بایان، منجیرے، بچھونے، گاؤ تکئے، بچے کے پوتڑے، نہالچے، لحاف، توشک، سلامتی سے سب ہوا چاہیں۔ یعنی معلوم ہونا چاہیئے اس کا کیا سامان کیا گیا ہے اور رہاں بڑی بات تو رہی جاتی ہے یعنی ان سب کا کرایہ کون دے گا۔ بی صاحبہ خدانخواستہ کیوں دینے لگیں۔ کیا وجہ کہ یہ نہایت بدشگونی ہوگی۔ دوسرے اگر یہ جرمانہ دینا پڑا تو متعلّقین کیا معنی متعلّقین کے متعلّقین یعنی شوہران اور برخوردار بھی گھر سے باہر نہ نکلنے پائیں گے۔ پھر اگر مع اعزا و اقربا و احباب و متعلّقین کے بلانا چاہتے ہیں، تو پہلے جلسے کی جانب سے سواریوں کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ تو پھر اللہ تے جا ہا تو تل دھرنے کی جگہ نہ ملے گی۔ اینٹی بھائی بقولِ اہلِ دکن اپنا اپنا 'کھٹلا' لئے موجودِ جلسہ ہوں گے۔ طاعون والے جلسے میں تو دکانیں بند تھیں۔ اس دفعہ چولھے تک گھروں میں نہ گرم ہوں تب کی سند۔ مگر جائے استاد خالی۔ ایک بات مشتہر صاحبان بھول گئے یعنی متعلّقین کو تو طلب کیا مگر رنڈیوں، خانگیوں کا کہیں ٹھکانہ نہ کیا۔ جو ایک کیا

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

شوکت تھانوی (۱۹۰۴ء - ۱۹۶۳ء)

سودیشی ریل (اقتباسات)

ہمارے ایسے آدمی کے لئے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں اور ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"بابو جی کانپور کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیجیے۔"

بابو جی نے بجائے اس کے ٹکٹ دے دیتے پہلے تو ہم کو گھورا، پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے "۔ ایک بات کہدیں یا مول تول"۔

میں سمجھا بابو جی مذاق کر رہے ہیں اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابو جی نے پھر کہا۔

"جناب سُنئے تین روپے ہوئے۔ لائیے اور ٹکٹ لے لیجیے۔"

اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا "جناب تین روپے کیسے ہوئے؟ ایک روپیہ تیرہ آنے تو کرایہ ہے، آپ کہتے ہیں تین روپے۔ مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہیئے ہے۔ کانپور کا سیکنڈ کلاس۔"

بابو جی نے ذرا ترش رو ہو کر جواب دیا "جناب والا میں بہرا نہیں ہوں۔ سن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیے۔ مگر اس کے تین روپے ہوئے۔ کوڑی کم نہ لوں گا۔ جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجیے۔"

میں "مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنے کرایہ تھا۔ آج کیا ہو گیا کہ ایک دم بڑھ گیا؟"

بابو "کل کی بات کل کے ساتھ۔ آج دلیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراج مل گیا ہے۔"

میں "یہ کہئے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجیے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

بابو "لائیے روپے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات۔ ڈھائی روپے دے دیجیے اور ٹکٹ لے لیجیے۔"

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصہ آ رہا تھا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا اور یہ سوچ کر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا۔ مجھ کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی "سُنئے تو جناب، ٹھہریئے تو جناب، دیکھیے تو جناب۔ اچھا دو روپے دیجیے۔ آیئے وہی ایک روپیہ تیرہ آنے دیجیے۔ اب وہ بھی نہ دیجیے گا؟ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے۔ لائیے ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کر سکتے۔ ہمارا نقصان ہو رہا ہے۔"

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ذرا گردن ترچھی کر کے وہیں سے کہہ دیا۔

"ایک روپیہ دیں گے، ایک روپیہ کو دینا ہے تو دے دو۔"

ہم سمجھتے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہونگے مگر واقعی کمال کیا انہوں نے کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے "۔ لائیے صاحب لائیے بوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہے۔"

اسٹیشن حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود بالکل یہ معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے یا اُلٹا باندھ کر ٹانگ دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی، وہی گھڑیال مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے۔ حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔ اسباب کے ٹھیلے پر پان والا اپنی دوکان لگائے بیٹھا تھا۔ قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہنچائیں۔ بمشکل تمام ایک قلی ملا۔ لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اٹھانے کو کہا۔ اس نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا۔

اندھے ہو، دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر"!

ہم "معاف کیجیے گا غلطی ہوئی" کہہ کر پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ یا اللہ یہ کیا انقلاب ہے۔ پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے۔ اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو قلی کس صورت کا ہو گا؟ مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اٹھایا اور کئی مرتبہ کر کے سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں رکھا جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ اسباب کو قرینہ سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہیئے کہ یہی گاڑی کانپور جائے گی یا کوئی اور۔ سب سے پہلے تو ہم نے انہیں حضرت سے پوچھا جو ہمارے ڈبہ میں تشریف فرما تھے لیکن انہوں نے صرف جواب دیا "بائی بھیا ہمکا ناہیں مالوم" یہ حاتم سودیشی ریل کے سیکنڈ کلاس کے معزز پسنجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ "اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائیگی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلی جائے گی۔ اسی لئے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف۔"

ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء تا ۱۹۵۸ء)

حکایتِ زاغ و بُلبُل

ایک دن صبح چائے پیتے ہوئے نہیں معلوم سید محمود صاحب کو کیا سوجھی ایک طشتری میں تھوڑی سی شکر لے کر نکلے اور صحن میں جا بجا کچھ ڈھونڈھنے سے لگے ع گوئی ایں طائفہ ایں جا گہرے یافتہ اند۔

جب ان کا تعاقب کیا گیا تو معلوم ہوا چیونٹیوں کے بل ڈھونڈھ رہے ہیں جہاں کوئی سوراخ دکھائی دیا شکر کی ایک چٹکی ڈال دی۔

وللارض من کاسِ الکرام نصیبٌ

یہاں کمروں کی چھتوں پر گوریّاؤں کے جوڑوں نے جا بجا گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ دن بھر ان کا شور و ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ چند دنوں کے بعد محمود صاحب کو خیال ہوا اُن کی بھی کچھ تواضع کرنی چاہیئے۔ ممکن ہے گوریّاؤں کی زبانِ حال نے انہیں توجہ دلائی ہو کہ ع

نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں!

چھپرہ میں ایک مرتبہ انہوں نے مرغیاں پالی تھیں۔ دانہ ہاتھ میں لے کر آ آ کرتے تو ہر طرف سے دوڑتی ہوئی چلی آتی تھیں۔ یہی نسخہ چڑیوں پر بھی آزمانا چاہا لیکن چند دنوں کے بعد تھک کر بیٹھ رہے کہنے لگے۔ عجیب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں اتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں۔ گویا دانہ کی پیش کش بھی ایک جرم ہوا ؎

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر ہے اُلٹی کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اُٹھایا ہے تو عشوۂ ناز کی تغافل کیشیوں کے لئے صبر و شکیب پیدا کیجئے۔ نیازِ عشق کے دعووں کے ساتھ نازِ حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں۔

یہاں کبھی کبھی صبح کو جنگلی میناؤں کے بھی جوڑے آ نکلتے ہیں اور اپنی غُرغُر اور چیو چیو کے شور سے کان بہرا کر دیتے ہیں۔ اب محمود صاحب نے گوریّاؤں کے عشق پر تو واسوخت پڑھا مگر ان آہوانِ ہوائی کے لئے دامِ ضیافت بچھا دیا۔ ع من و آہوئے صحرائی کہ دائم می رمید از من

روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے اور صحن میں جا کھڑے ہوتے پھر جہاں تک حلق کام دیتا "آ آ" کرتے جاتے اور ٹکڑے فضا کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے۔ یہ صلائے عام میناؤں کو ملتفت نہ کر سکی البتہ شہرستانِ ہوا کے دریوزہ گرانِ ہرجائی یعنی کوّوں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا۔ میں نے کوّوں کو شہرستانِ ہوا کا دریوزہ گر اس لئے کہا کہ انہیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں طفیلیوں کے غول میں بھی بہت کم دکھائی پڑے۔ ہمیشہ اسی عالم میں پایا کہ فقیروں کی طرح ہر دروازے پر پہنچے۔ صدائیں لگائیں اور چل دیے۔ ع فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔

بہرحال محمود صاحب "آ آ" کے تسلسل سے تھک کر جونہی مڑتے یہ دریوزہ گرانِ کوتہ آستیں فوراً بڑھتے اور اپنی دراز دستیوں سے دسترخوان صاف کر کے رکھ دیتے۔

محمود صاحب کے صلائے عام سے پہلے ہی یہاں کوّوں کی کائیں کائیں کی روشن چوکی برابر بجتی رہتی تھی۔ اب جو اُن کا دسترخوانِ کرم بچھا تو نقاروں پر بھی چوب پڑ گئی۔ ایک دو دن تک تو لوگوں نے صبر کیا۔ آخر اُن سے کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دستِ کرم کی بخششیں رک نہیں سکتیں تو کم از کم چند دنوں کے لئے ملتوی ہی کر دیجئے۔ ورنہ ان ترکانِ یغما دوست کی ترکتازیاں کمروں کے اندر کے گوشہ نشینوں کو بھی امن چین سے بیٹھنے نہ دیں گی اور ابھی تو صرف احمد نگر ہی کے کوّوں کو خبر ملی ہے۔ اگر فیضِ عام کا یہ لنگر خانہ اسی طرح جاری رہا تو عجب نہیں تمام دکن کے کوے قلعۂ احمد نگر پر حملہ بول دیں اور آپ کو صائب کا شعر یاد دلائیں ؎

دور دستاں را باحساں یاد کردن ہمت است ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر می افگند

ابھی محمود صاحب اس درخواست پر غور کر ہی رہے تھے کہ ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آ گیا۔ ایک صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی منڈیر پر دو معمّر و مسّن گِدھ بھی تشریف آئے ہیں ؎

پیری سے کمر میں اک ذرا خم تو قیر کی صورتِ مجسّم
اور گردن اٹھائے صلائے سفرہ کے منتظر ہیں ع

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی

معلوم ہوتا ہے کہ ان ناخواندہ مہانوں کی آمد محمود صاحب پر بایں ہمہ جود و سخائے عام گراں گزری۔ کہنے لگے بزرگوں نے کہا ہے گِدوں کا آنا منحوس ہوتا ہے۔ بہرحال ان حضرات کے بارے میں بزرگانِ سلف کا کچھ ہی خیال رہا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی تشریف آوری ہمارے لئے تو بڑی بابرکت ثابت ہوئی۔ کیونکہ اِدھر ان کا مبارک قدم آیا اُدھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لئے اپنا سفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملہ پر یوں بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے کہ اُن کی آبادی میں اس ہنگامۂ ضیافت کی ویرانی پوشیدہ تھی۔ دیکھیے کیا موقع سے مومن خاں کا قصیدہ یاد آ گیا:

شیخ جی آپ کے آتے ہی ہُوا دَیر خراب
قصد کعبہ کا نہ کیجئے گا بایں یُمنِ قدوم

سعادت حسن منٹو

سویرے جو کل آنکھ میری کھُلی

عجیب تھی بہار اور عجیب سیر تھی۔ یہی جی میں آیا کہ گھر سے نکل۔ ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل ——— باغ پہنچنے سے پہلے ظاہر ہے کہ میں نے کچھ بازار اور کچھ گلیاں طے کی ہوں گی اور میری آنکھوں نے کچھ دیکھا بھی ہوگا۔ پاکستان تو پہلے ہی دیکھا بھالا تھا۔ پر جب سے 'زندہ باد' ہوا وہ کل دیکھا، بجلی کے کھمبے پر دیکھا، پرنالے پر دیکھا، شہ نشین پر دیکھا، چھجّے پر دیکھا، غرض کہ ہر جگہ دیکھا اور جہاں نہ دیکھا وہاں دیکھنے کی حسرت لئے گھر لوٹا۔

پاکستان زندہ باد ——— یہ لکڑیوں کا ٹال ہے —— پاکستان زندہ باد۔ فنٹافنٹ مہاجر ہیر کٹنگ سیلون۔ پاکستان زندہ باد۔ یہاں نالے مرمت کئے جاتے ہیں ——— پاکستان زندہ باد۔ گر ناگرہ جائے ——— پاکستان زندہ باد۔ بیمار کپڑوں کا ہسپتال —— پاکستان زندہ باد۔ الحمد للّٰہ یہ دوکان سید اوزار حسین مہاجر جالندھری کے نام الاٹ ہوگئی ہے۔

ایک مکان کے باہر یہ بھی لکھا ہوا دیکھا ——— پاکستان زندہ باد۔ یہ گھر ایک پارسی بھائی کا ہے . . . یعنی حضرت کہیں اسے بھی نہ الاٹ کرا لیجیے گا۔

صبح کا وقت تھا۔ عجب بہار تھی اور عجب سیر تھی۔ قریب قریب ساری دوکانیں بند تھیں۔ ایک حلوائی کی دوکان کھلی تھی۔ میں نے کہا چلو لسّی ہی پیتے ہیں۔ دوکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل تو رہا ہے لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا "یہ اُلٹے رُخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟"

اس نے گھور کر دیکھا اور کہا "دیکھتے نہیں ہو؟"

میں نے دیکھا ——— پنکھے کا رُخ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی رنگین تصویر کی طرف تھا جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھی ——— میں نے زور کا نعرہ لگایا۔ "پاکستان زندہ باد" اور لسّی پئے بغیر آگے چل دیا۔

بند دوکان کے تھڑے پر ایک آدمی پُوریاں تل رہا تھا۔ میں سوچنے لگا ابھی پرسوں میں نے اس دوکان سے چپّل خریدے تھے، یہ پُوری والا کدھر سے آگیا۔ خیال آیا شاید کوئی دوسری دوکان ہو۔ لیکن بورڈ وہی تھا۔ سامنے وہی فسادات میں جھلسا ہوا مکان تھا کہ جس کی برساتی میں بجلی کا پنکھا لٹک رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ آگ جلانے میں اس نے بھی کافی مدد دی ہوگی۔ پُوری والے نے مجھے مخاطب کیا اور کہا "کیا سوچ رہے ہیں آپ بابوجی۔ گرما گرم پُوریاں ہیں"

میں نے کہا "بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جہاں تم بیٹھے ہو یہاں جُوتوں کی ایک دوکان ہوا کرتی تھی۔"

پُوری والا اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مسکرایا "جُوتوں کی دوکان اب بھی ہے لیکن وہ نو بجے شروع ہوتی ہے اور میری صبح چھ بجے سے شروع ہوتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتی ہے۔"

میں آگے بڑھ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی سڑک پر کانچ کے ٹکڑے بکھیر تا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بھلا آدمی ہے۔ اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ لوگوں کو تکلیف دیں گے اس لئے سڑک پر سے چن رہا ہے لیکن جب میں نے دیکھا کہ چننے کے بجائے وہ بڑی ترتیب سے انہیں اِدھر اُدھر گرا رہا ہے تو میں کچھ دیر کھڑا ہوگیا۔

جھولی خالی کرنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے بچھے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی ایک درخت تھا۔ اس پر ایک بورڈ لگا تھا "یہاں سائیکلوں کے پنکچر لگائے جاتے ہیں اور ان کی مرمّت کی جاتی ہے۔"

میں نے قدم تیز کر دیئے۔

دوکانوں کے سائن بورڈوں میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آئی۔ پہلے قریب قریب سب انگریزی میں ہوتے تھے۔ اب کچھ دوکانوں پر نام اور تحریر دونوں اردو لباس میں نظر آئے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے جیسا دیس ویسا بھیس۔

تحریر خوشخط تھی اور نام بھی جاذبِ نظر تھے۔ مثال کے طور پر "آرائش"۔ ظاہر ہے کہ دوکان میں آرائش سے متعلقہ سامان ہوگا۔ ایک ہوٹل کھلا تھا۔ اس کی پیشانی پر اردو رسم الخط میں "ماحضر" لکھا تھا۔ آگے چل کر ایک دوکان تھی جس کا نام "پاپوشیانہ" تھا یعنی جوتوں کا آشیانہ۔ ایک دوکان کی پیشانی پر بورڈ آویزاں تھا "زمہریر"۔ ضرور قلفیوں کی دوکان ہوگی۔

میں نے خوش ہوکر "پاکستان زندہ باد" کہا اور چلتا رہا۔

کچھ دُور آگے بڑھا تو دیکھا ایک آدمی چھوٹے سے لڑکے کو دھڑا دھڑ مار رہا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ لڑکا نوکر ہے اور اس نے ایک روپے کا نوٹ گما دیا ہے۔ میں نے اس ظالم کو جھڑکا اور کہا "کیا ہوا بچّہ ہے۔ کاغذ کا چھوٹا پرزہ ہی تو ہوتا ہے۔ ایک روپے کا نوٹ

ہم نے گھبرا کر پوچھا "لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا؟"
جواب ملا "جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہوسکتا ہے۔"
ہم نے پھر پوچھا "لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا؟"
جواب ملا کہ "ہوجایا کرے جب تک نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جاسکتی ہے۔ کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟"

گیارہ سے بارہ، بارہ سے ایک، ایک سے دو بجے مگر نہ گھڑی کی سوئی ہٹی نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی۔ صرف ہم ٹہلتے رہے۔ خدا خدا کرکے ایک آدمی نے بہ آوازِ بلند چیخنا شروع کیا "بیٹھنے والے مسافر بیٹھو، گاڑی چھوٹتی ہے۔"

ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈھا۔ پھر مغرب کی طرف۔ مگر دونوں طرف انجن غائب تھا اور ہماری بالکل سمجھ میں نہ آیا کہ بغیر انجن کے گاڑی کس طرح چھوٹ سکتی ہے اور ان الفاظ پر شک اس لئے کفر سمجھتے تھے کہ ان کا کہنے والا کوئی ذمہ دار شخص تھا بلکہ وہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب تھے جن کو ہم قلی سمجھے تھے۔ بہرحال بغیر کچھ سوچے سمجھے ہم اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی دو تین درجن لٹھ بند گنوار ہمارے درجہ میں گھس آئے ان سے ہم نے لاکھ کہا "ارے سیکنڈ کلاس ہے اماں سیکنڈ کلاس ہے۔" مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے۔ "ہم ہو جانت ہے۔ ڈیوڑھا ہے۔ ہم ٹکس لیا ہے۔"

ہم کو بیٹھے بیٹھے بھی ایک گھنٹے کے قریب ہو گیا۔ گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر ہم پلیٹ فارم پر آئے تو دیکھا انجن گاڑی پر لگایا جا رہا ہے۔ لیکن انجن لگنے کے بعد گاڑی جب دیر تک نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی سکریٹری صاحب ٹاؤن کمیٹی کا انتظار ہے، وہ کانپور جائیں گے انہوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آجائیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی لانے کے لئے گیا ہوا ہے۔

غرض ان کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی سن سن کرنے لگا۔ ایک کھدر پوش زیر پا بزرگوار لال اور سبز گاڑھے کی جھنڈیاں لئے ہوئے بھی نمودار ہوتے اور ہم نے اپنی جگہ پر سمجھ لیا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب نے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سرخ اور پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے غلطی سے سرخ جھنڈی ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ "گھنٹہ بھر سے سیٹی بجا رہا ہوں مگر تمہارے کان میں آواز نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے؟"

ڈرائیور نے بھی ان کے بے جا غصہ کا جواب کوک کر دیا۔ "جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں؟ میرا کیا قصور ہے؟ دو گھنٹے سے للّو فائرمین کوئلہ لینے گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا کہ لپک کر جلدی سے لے آ۔ ابھی تک غائب ہے۔ معلوم نہیں کہاں گیا۔ پتہ بھی بتا دیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے یا عیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا۔ دو چار پیسے زیادہ کا خیال نہ کرنا، مگر وہ جا کر مر رہا۔ اب بتائیے میرا کیا قصور ہے؟"

گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر چپ ہو گئے اور کوئلہ کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔

کامل ڈیڑھ گھنٹہ بعد للّو فائرمین کوئلہ کی گٹھڑی لئے یہ کہتا ہوا آ پہنچا۔ "آدھی رات کو کوئلہ منگوانے چلے ہیں۔ تمام دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک دوکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ نو آنے میں ملا ہے۔ بھاگتا ہوا آ رہا ہوں۔ راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ تمام گھٹنے چھل گئے۔ کوئلہ وغیرہ دن سے منگوالیا کرو۔"

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی۔ گاڑی چلی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا "روکو، روکو، گارڈ صاحب رہ گئے۔" گاڑی رکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی دو فرلانگ بمشکل سے چلی ہوگی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب نے ڈرائیور سے چلا چلا کر پوچھنا شروع کیا "ارے لائن کلیر بھی لے لیا تھا —— لائن کلیر؟" ڈرائیور نے بھی چلا کر جواب دیا "لے لیا تھا —— لے لیا تھا ——" گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی اطمینان کر لیا تو پھر فرمایا "اچھا تو چھوڑو گاڑی، میں سیٹی بجاتا ہوں۔"

■■

بقیہ — خواجہ بدیع الزماں عرف خوجی

بنا ہوا مگر جو لوگ مبصر ہیں وہ سمجھتے ہیں نازک بدن ہے۔ ہوں شریف زادہ اور خود شریف ابن شریف ابن شریف تین پشت تک کا حال معلوم ہے کہ شریف زادہ ہوں آگے پتا نہیں چلتا۔ بایں ہمہ شرافت جو لوگ ناواقف ہیں دیکھتے ہی کہتے ہیں کہ یہ کوئی پاجی ہے صورت سے پاجی پن برستا ہے مگر سیرت خدا نے وہ دی ہے کہ کسی شریف کے باپ کو بھی نہیں نصیب ہوئی۔ عقل اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ افلاطون اگر زندہ ہوتا تو شاگردی کرتا اور لقمان زانوئے ادب تہہ کرتا۔ یونان کے حکیم جوتیاں من بدیع کی سیدھی کرتے مگر اس کی کریمی کے صدقے جو دیکھتا ہے کہتا ہے یہ شخص گدھا ہے اس کو عقل کہاں لا اللہ کی کیا دین ہے کہ بنایا عقل مجسم اور لوگ گدھا سمجھتے ہیں۔" اس بندہ نوازی کے قربان۔ واہ میرے مولا، واہ صدقے اس بخشش کے۔"

مشتاق احمد یوسفی

چارپائی اور کلچر

(اقتباسات)

چارپائی ایک ایسی خود کفیل تہذیب کی آخری نشانی ہے جو نئے تقاضوں اور ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نت نئی چیزیں ایجاد کرنے کے قائل نہ تھی بلکہ ایسے نازک مواقع پر پرانی چیزوں میں نئی خوبیاں دریافت کر کے مسکرا دیتی تھی۔ اس عہد کی رنگا رنگ مجلسی زندگی کا تصور چارپائی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا خیال آتے ہی ذہن کے اُفق پر بہت سے سُہانے منظر اُبھر آتے ہیں۔ اُجلی اُجلی ٹھنڈی چادریں، خس کے پنکھے، کچی مٹی کی سَن سَن کرتی کوری صراحیاں، چھڑکاؤ سے بھیگی زمین کی سوندھی سوندھی لپٹ اور آم کے لدے پھندے درخت جن میں آموں کے بجائے لڑکے لٹکے رہتے ہیں اور اُن کی چھاؤں میں جوان جسم کی طرح کسی کسائی ایک چارپائی، جس پر دن بھر شطرنج کی بساط بازی کی پھڑ جمی اور جو شام کو دسترخوان بچھا کر کھانے کی میز بنالی گئی۔ ذرا غور سے دیکھئے تو یہ وہی چارپائی ہے جس کی سیڑھی بنا کر سُگھڑ بیویاں مکڑی کے جالے اور چلبلے لڑکے چڑیوں کے گھونسلے اُتارتے ہیں۔ اس چارپائی کو وقتِ ضرورت پٹیوں سے بانس باندھ کر اسٹریچر کے قابل بنایا جا سکتا ہے اور بجوگ پڑ جائے تو انہیں بانسوں سے ایک دوسرے کو اسٹریچر کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مریض جب کھاٹ سے لگ جائے تو تیمار دار مؤخر الذکر کے وسط میں بڑا سا سوراخ کر کے اول الذکر کی مشکل آسان کر دیتے ہیں اور جب ساون میں کالی کالی گھٹائیں اٹھتی ہیں تو ادوان کھول کر لڑکیاں دروازے کی چوکھٹ اور والدین چارپائیوں میں جھولتے ہیں۔ اسی پر بیٹھ کر مولوی صاحب قمچی کے ذریعے اخلاقیات کے بنیادی اصول ذہن نشین کراتے ہیں۔ اسی پر نومولود بچے غاؤں غاؤں کرتے چندھیائی ہوئی آنکھیں کھول کر اپنے والدین کو دیکھتے ہیں اور روتے ہیں اور اسی پر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پیاروں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

غور کیجئے تو مباحثے اور مناظرے کے لئے چارپائی سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ اس کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ فریقین آمنے سامنے نہیں بلکہ عموماً اپنے حریف کی پیٹھ کا سہارا لے کر آرام سے بیٹھتے ہیں اور بحث و تکرار کے لئے اس سے بہتر طرزِ نشست ممکن نہیں کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ فریقین کو ایک دوسرے کی صورت نظر نہ آئے تو کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر میرا عرصے سے یہ خیال ہے کہ اگر بین الاقوامی مذاکرات گول میز پر نہ ہوئے ہوتے تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں۔

لوگ گھنٹوں چارپائی پر کسمساتے رہتے ہیں مگر کوئی اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ اس لئے کہ ہر شخص اپنی جگہ بخوبی جانتا ہے کہ اگر وہ چلا گیا تو فوراً اس کی غیبت شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ پچھلے پہر تک مرد ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے بحث کرتے ہیں اور عورتیں گال سے گال بھڑا کے کچر کچر لڑتی رہتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مرد پہلے بحث کرتے ہیں پھر لڑتے ہیں، عورتیں پہلے لڑتی ہیں اور بعد میں بحث کرتی ہیں مجھے آخر الذکر طریقہ زیادہ معقول نظر آتا ہے اسلئے کہ اس میں آئندہ سمجھوتے اور میل ملاپ کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ ایک چارپائی پر بیک وقت کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں تو گذارش ہے کہ چارپائی کی موجودگی میں ہم نے کسی کو کھڑا نہیں دیکھا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ تنگ سے تنگ چارپائی پر بھی لوگ ایک دوسرے کی طرف پاؤں کئے اَ اِ کی شکل میں سوتے رہتے ہیں چنچل ناری کا چیتے جیسا اچیت بدن ہو یا کسی عمر رسیدہ کی کمان ایسی خمیدہ کمر۔ یہ اپنے آپ کو ہر قالب کے مطابق ڈھال لیتی ہے اور نہ صرف یہ کہ اس میں بڑی وسعت ہے بلکہ اتنی لچک بھی ہے کہ آپ جس آسن چاہیں بیٹھ اور لیٹ جائیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ بیٹھنے اور لیٹنے کی جو درمیانی صورتیں ہمارے ہاں صدیوں سے رائج ہیں ان کے لئے یہ خاص طور سے موزوں ہے۔ یوروپین فرنیچر سے مجھے کوئی چڑ نہیں لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ایشیائی مزاج نیم خیزی اور نیم درازی کے جن زاویوں اور آسائشوں کا عادی ہو چکا ہے وہ اُس میں میسر نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر ہم صوفے پر اکڑوں نہیں بیٹھ سکتے۔ کوچ پر دسترخوان نہیں بچھا سکتے۔ اسٹول پر قیلولہ نہیں کر سکتے اور کرسی پر بقول اخلاق احمد دہلوی اُردو میں "نہیں بیٹھ سکتے"۔

ایشیا نے دنیا کو دو نعمتوں سے روشناس کیا۔ چائے اور چارپائی۔ اور ان میں یہ خاصیت مشترک ہے کہ دونوں سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہیں۔

چارپائی کی سب سے خطرناک قسم وہ ہے جس کے بچے کُھچے اور ٹوٹے بانوں میں اللہ کے برگزیدہ بندے محض اپنی قوتِ ایمان کے زور سے

کہیں گر پڑا ہوگا۔ خبردار جو تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔"

یہ سن کر وہ آدمی مجھ سے الجھ گیا اور کہنے لگا "تمہارے نزدیک ایک روپے کا نوٹ کاغذ کا ایک چھوٹا سا پُرزہ ہے لیکن جانتے ہو کتنی محنت کے بعد یہ کاغذ کا چھوٹا سا پُرزہ ملتا ہے آج کل۔" یہ کہہ کر وہ پھر اس بچّے کو پیٹنے لگا۔ مجھے بہت ترس آیا۔ جیب سے ایک روپیہ نکالا اور اس آدمی کو دے کر بچے کی جان چھڑائی۔

چند قدموں ہی کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک آدمی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا "روپیہ دے دیا آپ نے؟"

میں نے جواب دیا "جی ہاں، بہت بُری طرح پیٹ رہا تھا بیچارے کو۔"

"بیچارہ اس کا اپنا لڑکا ہے۔"

"کیا کہا؟"

"باپ اور بیٹے دونوں کا یہی کاروبار ہے دو چار روپے روزانہ اس ڈھنگ سے پیدا کر لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے" اور قدم بڑھا دیئے۔

ایک دم شور سا برپا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے بنڈل لئے چلا رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے تھے تازہ تازہ اور گرم گرم خبریں۔ دہلی میں جوتا چل گیا۔ لکھنؤ میں فلاں لیڈر کی کوٹھی پر کُتّوں نے حملہ کر دیا۔ پاکستان کے ایک نجومی کی پیشین گوئی۔ کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔

سینکڑوں ہی اخبار تھے۔ آج کا تازہ "نوائے صبح"۔ آج کا تازہ "ابوالوقت" آج کا تازہ "سنہرا پاکستان"۔

اخبار فروش لڑکوں کا سیلاب گذر گیا تو ایک عورت نظر آئی۔ عمر ہی کوئی پچاس کے لگ بھگ، سنجیدہ اور متین صورت۔ ایک ہاتھ میں تھیلا تھا دوسرے میں اخباروں کے بنڈل۔

میں نے پوچھا۔

"کیا آپ اخبار بیچتی ہیں؟"

مختصر جواب ملا "جی ہاں"

میں نے دو اخبار خریدے اور دل میں اس اخبار فروش خاتون کا احترام لئے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر میں کتّوں کا ایک غول کا غول نمودار ہوا بھونک رہے تھے۔ پیار کر رہے تھے اور کاٹ بھی رہے تھے۔ میں ڈر کر ایک طرف ہٹ گیا کیونکہ چند روز پہلے ایک کُتّے نے مجھے کاٹ لیا تھا اور پورے چودہ دن سی بی کے ٹیکے مجھے اپنے پیٹ میں لگوانے پڑے تھے۔

میں نے سوچا کیا یہ کتّے پناہ گزیں ہیں یا وہ جو یہاں سے جانے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ کوئی بھی ہوں ان کا خیال تو رکھنا چاہیئے جو پناہ گیر ہیں اُن کو پھر سے آباد کیا جائے اور جو بے آقا ہو گئے ہیں اُن کو نسل کے اعتبار سے اُن لوگوں کے نام الاٹ کر دیا جائے جن کے کتّے اُس پار رہ گئے ہیں؟ اور جن کا کوئی والی وارث نہیں ان کے لئے لکڑی کی ٹانگیں مہیا کی جائیں تاکہ وہ انہیں سے اپنا شغل پورا کرتے رہیں۔

کتّوں کا غول چلا گیا تو میری جان میں جان آئی میں نے قدم بڑھانے شروع کئے میں نے ایک اخبار کھولا اور اسے دیکھنا شروع کیا سرورق پر ایک فلم ایکٹرس کی تصویر تھی تین رنگوں میں ایکٹرس کا جسم نیم عریاں تھا نیچے یہ عبارت درج تھی۔

"فلموں میں بے حیائی کا مظاہرہ کیسے کیا جاتا ہے اس کا کچھ اندازہ اوپر کی تصویر سے ہوگا"۔ میں نے دل ہی دل پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا اور اخبار کو فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔ دوسرا اخبار کھولا۔ ایک چھوٹے سے اشتہار پر نظر پڑی۔ مضمون تھا۔

"میں نے کل اپنی سائیکل لائیڈ بینک کے باہر رکھی۔ کام سے فارغ ہو کر جب لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سائیکل پر پرانی گدی کسی ہوئی ہے لیکن نئی غائب ہے۔ میں غریب مہاجر ہوں جن صاحب نے لی ہو براہِ کرم مجھے واپس کر دیں۔"

میں خوب ہنسا اور اخبار تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

چند گز کے فاصلے پر ایک جلی ہوئی دُکان دکھائی دی اس کے اندر ایک آدمی برف کی دو موٹی موٹی سلیں رکھے بیٹھا تھا۔ میں نے دل میں کہا "اس دکان کو آخر کسی طرح سے ٹھنڈک پہنچ ہی گئی"۔

بہت آگے نکل گیا۔ جگہ جانی پہچانی تھی مگر وہ بُت کہاں تھا جو میں دیکھا کرتا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے جو گھاس کے تختے پر استراحت فرما رہا تھا پوچھا "کیوں صاحب یہاں ایک بُت ہوتا تھا وہ کہاں گیا؟"

استراحت فرمانے والے نے آنکھیں کھولیں اور کہا "چلا گیا۔"

"چلا گیا۔ آپ کا مطلب ہے اپنے آپ چلا گیا؟"

وہ مسکرایا "نہیں، لے گئے۔"

میں نے پوچھا "کون؟"

جواب ملا "جن کا تھا۔"

میں نے دل میں کہا "لو اب بُت بھی ہجرت کرنے لگے۔ ایک دن وہ بھی آئیگا جب لوگ اپنے مُردے بھی قبروں سے اکھاڑ کر لے جائیں گے۔"

میں سوچتے ہوئے قدم اُٹھانے والا تھا کہ ایک صاحب نے جو میری طرح ٹہل رہے تھے مجھ سے کہا "بت کہیں گیا نہیں یہیں ہے اور محفوظ ہے۔"

میں نے پوچھا "کہاں؟"

انہوں نے جواب دیا "عجائب گھر میں۔"

میں نے دل میں دعا کی "اے خدا وہ دن نہ لائیو کہ ہم سب عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہو جائیں۔"

■■

قدیم داستانوں کی روٹھی رانی اس پر اپنے جوڑے کا تکیہ بنائے اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑتی تھی اور آج بھی سہاگنیں اسی کی اوٹ میں ادوان میں سے ہاتھ نکال کر پانچ انگل کی کلائی میں تین انگل کی چوڑیاں پہنتی اور گشتی نجومیوں کو ہاتھ دکھا کر اپنے بچوں، سوکنوں کی تعداد پوچھتی ہیں لیکن جن بھاگوانوں کی گود بھری ہو ان کے بھرے پُرے گھر میں آپ کو چارپائی پر پوتڑے اور سَویاں ساتھ ساتھ سوکھتی نظر آئیں گی۔ گھٹنیوں چلتے بچے اس کی پٹی پکڑ کر میّوں میّوں چلنا سیکھتے ہیں اور رات برات پائنتی سے قدمچوں کا کام لیتے ہیں لیکن جب ذرا سمجھ آجاتی ہے تو اسی چارپائی پر صاف ستھرے تکیوں سے لڑتے ہیں۔ نامور پہلوانوں کے بچپن کی چھان بین کی جائے تو پتہ چلے گا کہ انہوں نے قینچی اور دھوبی پاٹ جیسے خطرناک داؤ اسی اکھاڑے میں سیکھے۔

قدرت نے اپنی رحمت سے صفائی کا کچھ ایسا انتظام رکھا ہے کہ ہر ایک چارپائی کو سال میں کم از کم دو مرتبہ کھولتے پانی سے دھارنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو نفاست پسند حضرات جان لینے کا یہ طریقہ جائز نہیں سمجھتے وہ چارپائی کو اُلٹا کر کے چلچلاتی دھوپ میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر دن بھر گھر والے کھٹمل اور محلے والے عبرت پکڑتے ہیں۔ اہلِ نظر چارپائی کی چولوں میں رہنے والی مخلوق کی جسامت اور رنگت پر سونے والوں کی صحت اور حسب و نسب کا قیاس کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یورپ میں گھوڑوں اور کتّوں کے سوا کوئی کسی کا حسب نسب نہیں پوچھتا۔ الٹی چارپائی کو فرطبینہ کی علامت جان کر راہ گیر راستہ بدل دیں تو تعجب نہیں۔ حد یہ ہے کہ فقیر بھی ایسے گھروں کے سامنے صدا لگانا بند کر دیتے ہیں۔

بعض چارپائیاں اس قدر چغل خور ہوتی ہیں کہ ذرا کروٹ بدلیں تو دوسری چارپائی والا کلمہ پڑھتا ہوا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ اگر پاؤں بھی سکیڑیں تو کتّے اتنے زور سے بھونکتے ہیں کہ چوکیدار تک جاگ اٹھتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ لوگ رات بھر نہ صرف ایک دوسرے کی جان و مال بلکہ چال چلن کی بھی چوکیداری کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آپ ہی بتائیے کہ رات کو آنکھ کھُلتے ہی نظر سب سے پہلے پاس والی چارپائی پر کیوں جاتی ہے ــــ؟

(تلخیص)

■ ■

بقیہ — انڈے بچے والی چیل چلہار

معنی ساری دنیا کے متعلّقین ہونے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں اور معاملہ فہمی کا یہ حال ہے کہ بی جدّن، بی چودھرائن وغیرہ وغیرہ کا تجربہ ذاتی ... لتا ابنٹی بازووں کو کیا بڑے بڑوں تک کو ہوگا۔ پس اُن کی طرف آنکھ ... پھیر لینا یعنی چہ۔ بلوائیں اور ضرور بلوائیں۔ اس کے کیا معنی جہاں بگھیاں، پالکیاں، ڈولیاں ہوں وہاں چو پہلے نہ ہوں۔ واللہ ابنٹی و نبٹی تو چار دن کی بات ہے سابقہ تو اُنہیں سے پڑتا ہے۔ اگر اس تقریب میں اُنہیں نہ پوچھا تو بہتوں سے برادری ترک ہو جائے گی اور شادی بیاہ ہو یا ناچ گانوں کے جلسوں میں کوئی رنڈی مُنڈی ایک نہ آئے گی اور سفر والیوں کو جو شکایت ہوگی وہ نمک پر جراحت سمجھ لیں۔ اُن کی پیشوازی گورنمنٹ بھی اندرونی قوت رکھتی ہے۔ اُن کا سکّہ دلوں پر چلتا ہے۔ اُن کے طبلے کی گمک مانک منی توپ، سارنگی مارٹنی، مجیرے، مگزم گن سے زیادہ توڑ رکھتے ہیں اور بی صاحبہ تو پوری ڈائنامیٹ تارپیڈو ہی ہیں۔ اُن کے توڑ کا کیا پوچھنا بلکہ سچ پوچھو تو یہ لوگ سرنگ ہیں جن سے اکثر خاندان کے خاندان اڑ گئے۔ پس اُن کی زد سے ضرور بچنا چاہیئے۔

ساتھ میں لے کے اپنے یاروں کو — مینڈکی بھی چلی مداروں کو

اٹکے رہتے ہیں۔ اس قسم کے جھلنگے کو بچے بطور جھولا اور بڑے بوڑھے آلۂ تزکیۂ نفس کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اونچے گھرانوں میں اب ایسی چارپائیوں کو غریب رشتہ داروں کی طرح کونوں کھدروں میں آڑے وقت کے لئے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ خود مجھے مرزا عبدالودود بیگ کے ہاں ایک رات ایسی ہی چارپائی پر گذارنے کا اتفاق ہوا جس پر لیٹتے ہی اچھا بھلا آدمی نونِ غنّہ (ں) بن جاتا ہے۔

اس میں داخل ہو کر میں ابھی اپنے اعمال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ یکایک اندھیرا ہو گیا جس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ایک دوسرا ملازم اوپر سے ایک دری اوڑھا گیا اس خوف سے کہ دوسری منزل پر اور کوئی سواری نہ آجائے۔ میں نے سر سے دری پھینک کر اٹھنے کی کوشش کی تو گھٹنے بڑھ کے پیشانی کی بلائیں لینے لگے۔ کھڑ بڑ سن کر مرزا خود آئے اور چیخ کر پوچھنے لگے کہ "بھائی آپ ہیں کہاں؟" میں نے مختصراً اپنے محلِ وقوع سے آگاہ کیا تو انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچا۔ انہیں کافی زور لگانا پڑا۔ اس لئے کہ میرا سر اور پاؤں بانوں میں بُری طرح الجھے ہوئے تھے اور بان سر سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئے۔ بمشکل تمام انہوں نے مجھے کھڑا کیا اور میرے ساتھ ہی بلکہ مجھ سے کچھ پہلے ہی چارپائی بھی کھڑی ہو گئی۔

کہنے لگے "کیا بات ہے آپ کچھ بے قرار سے ہیں۔ معدے کا فعل درست نہیں معلوم ہوتا۔"

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ دوڑ کر اپنا تیار کردہ چورن لے آئے اور اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں ڈالا۔ مجھے آرام کرنے کی تلقین کر کے منہ دھونے چلے گئے۔

میں یہ چارپائی اوڑھے لیٹا تھا کہ ان کی منجھلی بچی آنکلی۔ تتلا کر پوچھنے لگی۔

"چچا جان۔ اکڑوں کیوں بیٹھے ہیں"

بعد ازاں سب بچے مل کر اندھا بھینسا کھیلنے لگے۔ بالآخر اُن کی امّی کو مداخلت کرنا پڑی۔

"کمبختو اب تو چپ ہو جاؤ۔ کیا گھر کو بھی اسکول سمجھ رکھا ہے"

چند منٹ بعد کسی شیر خوار کے دھاڑنے کی آواز آئی مگر جلد ہی یہ چیخیں مرزا کی لوریوں میں دب گئیں جن میں وہ ڈانٹ ڈانٹ کر نیند کو آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ چند لمحوں بعد مرزا اپنے نقشِ فریادی کو سینے سے چمٹائے میرے پاس آئے اور انتہائی لجاجت آمیز لہجے میں بولے۔

"معاف کیجئے آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ مگر منّو میاں آپ کی چارپائی کے لئے ضد کر رہے ہیں۔ انہیں دوسری چارپائی پر نیند نہیں آتی۔ آپ میری چارپائی پر سو جائیے۔ میں اپنی فولڈنگ چارپائی پر پڑ رہوں گا۔"

میں نے بخوشی منّو میاں کا حق منّو میاں کو سونپ دیا اور جب اس میں جھولتے جھولتے ان کی آنکھ لگ گئی تو ان کے والدِ بزرگوار کی زبان تالو سے لگی۔

اب سنئے مجھ پر کیا گذری۔ مرزا خود تو فولڈنگ چارپائی پر چلے گئے مگر جس چارپائی پر مجھ کو بطورِ خاص منتقل کیا اس کا نقشہ یہ تھا کہ مجھے اپنے ہاتھ اور ٹانگیں احتیاط سے تہہ کر کے بالترتیب سینہ اور پیٹ پر رکھنی پڑیں۔ اس کے حدودِ اربعہ کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ انگڑائی لینے کے لئے مجھے تین چار مرتبہ نیچے کودنا پڑا۔ کودنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اسکی اونچائی "درمیانہ" تھی۔ یہاں درمیانہ سے ہماری مراد وہ پست بلندی یا موزوں سطحِ مرتفع ہے جس کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو کہ

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے

گو کہ ظاہر بیں نگاہ کو یہ متوازی الاضلاع نظر آتی تھی مگر مرزا نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ بارش سے پیشتر یہ مستطیل تھی۔ البتہ بارش میں بھیگنے کے سبب جو کان آ گئی تھی اس سے مجھے کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہوئی۔ اسلئے کہ مرزا نے ازراہِ تکلف ایک پائے کے نیچے ڈکشنری اور دوسرے کے نیچے میرا نیا جوتا رکھ کر سطح درست کر دی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تہذیب کے جس نازک دور میں غیور مرد چارپائی پر دم توڑنے کے بجائے میدانِ جنگ میں دشمن کے ہاتھوں بے گور و کفن مرنا پسند کرتے تھے اسی قسم کی مردم آزار چارپائیوں کا رواج ہوگا۔ لیکن اب جب کہ دشمن سیانے اور چارپائیاں زیادہ آرام دہ ہو گئی ہیں مرنے کے اور بھی معقول اور باعزت طریقے دریافت ہو گئے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمارے ہاں ایک اوسط درجہ کے آدمی کی دو تہائی زندگی چارپائی پر گذرتی ہے اور بقیہ اس کی آرزو میں بالخصوص عورتوں کی زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے جو بساطِ محفل بھی ہے اور مونسِ تنہائی بھی۔ اسی کے سہارے وہ تمام مصائب انگیز کر لیتی ہیں۔ خیر مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں مگر عورتیں اس لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں کہ انہیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مئی جون کی جھلسا دینے والی دوپہر میں کنواریاں بالیاں چارپائی کے نیچے ہنڈ کلیاں پکاتی ہیں اور اوپر بڑی بوڑھیاں بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر کے ایک دوسرے کا لہو گرماتی رہتی ہیں۔ (قاعدہ ہے کہ جیسے جیسے حافظہ کمزور ہوتا جاتا ہے ماضی اور بھی سہانا معلوم ہوتا ہے) اسی پر بوڑھی ساس تسبیح کے دانوں پر صبح و شام اپنے پوتوں اور نواسوں کو گنتی رہتی ہے اور گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگتی ہے کہ خدا اُس کا سایہ بہو کے سر پر رہتی دنیا تک قائم رکھے۔ خیر سے بہری بھی ہے۔ اس لئے بہو اگر سانس لینے کے لئے بھی منہ کھولے تو گمان ہوتا ہے کہ مجھے کوس رہی ہوگی۔

کے احسانوں کو یاد نہیں رکھتے اور اُلٹا قصور وار ٹھہراتے ہو۔ کیا یہ احسان نہیں کہ ہر شہر میں جگہ جگہ فیئر پرائس شاپس کھلوا دی گئی ہیں؟ یہ اور بات ہے کہ یہ دوکانیں مہینے میں صرف ایک ہی آدھ بار کھلتی ہیں! تم دل سے اپنے پروردگار کا احسان مانو کہ وہ دلوں کا حال جاننے والا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اُن دوکانوں پر بھیڑ بہت زیادہ ہوتی ہے اور تمہیں چلچلاتی دھوپ، موسلا دھار بارش یا کڑکڑاتے جاڑے میں کیو میں چھ چھ گھنٹے کھڑا رہنا پڑتا ہے لیکن تم بددل نہ ہو اور ہمت نہ ہارو، اور تھکن اور ناامیدی کو پاس نہ پھٹکنے دو کہ خدا مایوس ہونے والوں کو دوست نہیں رکھتا!

اور اے مومنو! اتنی کوششوں اور اتنی ریاضت و مشقت کے بعد بھی تمہیں اناج نہ ملے تب بھی اپنے پیدا کرنے والے اور اپنے پالنے والے کی ذات سے مایوس نہ ہو۔ وہ تو کھونگے کے اندر کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے۔ پھر تم تو انسان سمجھے جاتے ہو ـــــ دیکھو یہ دُنیا بہت وسیع ہے تمہارے تصوّر اور تمہارے جدید ترین علم سے کہیں زیادہ، اس میں ذرائع بھی لامحدود ہیں اور تمہارا علم ابھی ناقص ہے۔ جو کچھ تم جانتے ہو، وہ صرف ایک بٹا سو حصّہ ہے اُس کا جو موجود ہے لیکن جسے تم نہیں جانتے۔ پس آنکھیں کھولو اور اپنے تخیل کو کام میں لاؤ۔ رزق تمہارے چاروں طرف پھیلا ہے۔ اور خدا تمہارا مددگار ہے کہ خدا ہمیشہ ڈھونڈھنے والے کو اُس کی محنت کا صلہ دیتا ہے ـــــ!!

تم شاید اب بھی نہیں سمجھے۔ ہاں تمہاری آنکھوں پر روایت کے پردے پڑے ہیں اور تمہارے کانوں میں جہالت کی روئی ٹھنسی ہے۔ تمہارا پروردگار جانتا ہے کہ تم اندھے اور بہرے ہو۔ تم نہ اچھائی کو دیکھ سکتے ہو، نہ سُن سکتے ہو اور اندھے کے آگے رونا اپنے نین کھونا ہے یا بھینس کے آگے تال سُر میں بین بجانا ہے۔ لیکن تمہارا خدا تم کو ایک موقع اور دیتا ہے۔ ہٹا دو یہ روایت کے پردے اور کھولو چشمِ بینا۔ اور دیکھو کہ تمہارے آگے میدانوں میں ہری ہری گھاس پھیلی ہے اور جنگل درختوں سے بھرے ہیں۔ اگر اناج ناپید ہے اور سبزی ترکاریاں عنقا، تو اے مومنو! تم بخوبی گھاس کھا سکتے ہو۔ درختوں کی پتیوں اور چھالوں سے ایک سے ایک عمدہ سالن تیار کر سکتے ہو۔ شاخوں کو پیس کے آٹا بنا سکتے ہو!

کیلے اور آلو کے چھلکے، کریلے کے بیج اور گوبھی کے ڈنٹھل، کیا انہیں تم کھا نہیں سکتے تھے؟ کیا دال کے چھلکے، دھان کا بھوسا اور بنولے کی کھلی اسی قابل تھے کہ تم اُسے اپنے جانوروں کے آگے ڈال دیتے، تم نے اپنے صحیح مقام کو نہ پہچانا اور وہ کام کر گئے جو خدا کے نزدیک ناپسندیدہ تھے۔ پس خدا تم سے ناخوش ہوا۔ اور خدا قادرِ مطلق ہے، وہ اپنے بندوں کو سزا دیتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ پس اُس نے تم کو سزا دی۔

اور اے مومنو! کیا تمہیں اس بات کی خبر نہیں کہ تمہیں تمہارے اعمال کی سزا اور جزا اُس دُنیا میں بھی ملے گی۔ پس تم اپنے اعمال کو پسندیدہ بناؤ، اُس جہان کے لئے کہ جسے زوال نہیں، جسے فنا نہیں۔ اُس عالمِ بقا کے لئے تمہارا پروردگار مادّیت کو پسند نہیں کرتا، رُوحانیت کو پسند کرتا ہے۔ پس اپنے پروردگار کی خوشنودی کے لئے مادّیت سے دامن کو بچاؤ اور روحانیت کو اپنا شیوہ بناؤ۔

پس اگر کھانے کے لئے اناج نہ ملے، اناج کے چھلکے نہ ملیں، پھل ترکاریاں نہ ملیں، پھل ترکاریوں کے چھلکے نہ ملیں اور کیڈبری چاکلیٹ (جسے تمہارا ریڈیو سیلون پوشٹک خوراک کہتا ہے) بھی نہ ملے تو رنج نہ کرو۔ کہ یہ رنج کا مقام نہیں بلکہ خوش ہونے کا ہے کہ تم مادّیت سے دُور اور رُوحانیت سے قریب ہو رہے ہو۔ پس اور کوشش کرو رُوحانیت سے قریب تر ہونے کی۔ اناج کے بدلے ہَوا کھاؤ۔ غم کھاؤ (کہ غم سے رُوح کو جِلا ملتی ہے، انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے!) افسروں کی ڈانٹ کھاؤ اور دوستوں کی چغلیاں کھاؤ اور اپنے گناہوں سے توبہ کرو کہ خدا بخشنے والا ہے!

اور اے خدا کے نیک بندو! جب ہَوا اور غم کھا کھا کے مادّیت اور روحانیت کا ایک دوسرے سے رشتہ ختم ہونے لگے یعنی مادّہ یا جسم مٹ جائے اور تمہاری روح قفسِ عنصری سے پرواز کرنے لگے تب بھی رنج نہ کرو اور نہ موت کے خیال سے خوف زدہ ہو کہ "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" (کہ ہر شئے اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے) اور یہی تمہاری منزل ہے اور اسی طرف تمہیں لَوٹ آنا ہے !!

اور کیا تم نہیں جانتے کہ فاقہ کی مَوت، مَوت نہیں شہادت ہے اور شہیدوں کے لئے تمہارے خدا نے، جو بڑا انصاف والا ہے، جنّت کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ جنّت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جہاں ہیرے، زمرّد اور یاقوت کے محل تمہارے لئے کھڑے ہیں۔ جن میں رہنے کے لئے نہ تمہیں پگڑی دینی پڑے گی اور نہ الاٹ منٹ آفیسر کے دَر کی دربانی کرنی پڑے گی۔

اور اے مومنو! اُس جنّت میں خاص تمہارے لئے ہر قسم کے پھل درختوں پر لدے ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے گھنٹوں کیو میں کھڑے نہ رہنا ہوگا اور تمہارے لئے گورنمنٹ ڈیری سے زیادہ خالص دُودھ اور کشمیر کے شہد سے زیادہ خالص شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ (تلخیص)

شفیقہ فرحت
گرلز کالج بھوپال

عہد نامۂ جدید

معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اللہ میاں نے اس خاکسار کے بنانے کا کام کسی بے حد کاہل اور ناکارہ فرشتے کے سپرد کر دیا تھا۔ سو نمونۂ کلام (عرف تصویر ——!) حاضر ہے ——!

اور وہ حضرت کاہل بھی اس درجہ کے تھے کہ آپ نے صفحۂ تقدیر یونہی سادہ یعنی کورا چھوڑ دیا۔ لہٰذا اس میں کچھ ہے نہیں۔ نہ کوئی غم۔ نہ خوشی۔ نہ ہنگامہ۔ نہ حادثہ۔

بس یونہی چلتے چلتے ایک دن ۱۹۵۱ء میں بی اے کر لیا۔ اور ۵۴ء میں ڈپلوما۔ اِن۔ جرنلزم کا بھی کورس کر لیا۔ پھر جو شامت آئی تو ہمارے پر نکل آئے۔ یعنی ۵۴ء جولائی میں شہر ناگپور سے (کہ جو ہمارا وطن کہلاتا تھا۔ اور جسے ادبی اعتبار سے جنگل بیابان بلکہ ریگستان کہا جا سکتا ہے ——!) ایک عدد رسالہ بچوں اور عورتوں کے لئے نکال لیا سال بھر میں عقل ٹھکانے آ گئی اور پیسہ ٹھکانے لگ گیا۔ سو اس پر فاتحہ پڑھ (غلط سلط!) ایک بار پھر صحرائے علم کی صحرا نوردی پر کمر باندھ لی اور ۵۷ء میں اردو میں ایم اے کر لیا اور بھوپال گرلز کالج میں نوکری کر لی اور اس سے کچھ ایسی وفاداری نبھائی کہ اسی کے ہو کے رہ گئے۔

چھپّن ستّاون سے لکھنا شروع کر دیا تھا مگر گرہ میں ہے کچھ نہیں۔ بعد مرنے کے غالب کے گھر سے چند تصویر بتاں اور چند حسینوں کے خطوط تو نکل ہی گئے تھے (یہ کم از کم توقع تھی ——!) مگر اپنے گھر سے اپنے مضامین بھی نہیں نکلیں گے —— ! کھونے کی تعداد اتنی زیادہ ہے اور بھولنے کا یہ عالم ہے کہ آدھی زندگی کھوئی ہوئی چیزوں کی تلاش میں گذر جاتی ہے۔

(فرحت)

اے دورِ جدید کے مومنو! —— خدا اُن کو عزیز رکھتا ہے جو اُس کی ہدایتوں پر عمل کرتے ہیں۔ اُس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں۔ تمہارے خدا نے ہر دور میں تمہاری ہدایت کے لئے ہادی اور نبی بھیجے لیکن تم نے اُن کی ایک نہ سُنی۔ تم نے ہر دور میں بغاوت کی اور تم اس دور میں بھی بغاوت پر آمادہ ہو۔ خدا باغیوں اور منکروں کو سخت سزا دیتا ہے لیکن سزا سے پہلے سنبھلنے کا موقع بھی دیتا ہے۔

تمہارے ملک سے گیہوں رُوپوش ہو گیا تو تم نے اُس کا ذمّہ دار حکومت کو ٹھہرایا۔ تم نے جلوس نکالے تم نے جگہ جگہ نہتے معصوم سیٹھوں کے گوداموں کو، جن میں ہزاروں اور لاکھوں من گیہوں چُھپا تھا لوٹنے کی کوشش کی۔ خدا تمہارے ان اعمال سے خوش نہیں۔ جب تم کچھ جانتے نہیں ہو تو ایسے کام کیوں کرتے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ آج دانہ گندم اولادِ آدم سے اپنی بے عزّتی کا انتقام لے رہا ہے ——؟ یاد کرو کل وہ اتنا حقیر تھا کہ اُسے کھا لینے کے جُرم میں آدم جنّت سے نکالے گئے تھے اور سزا کے طور پر گیہوں کو بھی ساتھ میں زمین پر بھیجا گیا تھا۔ اُسکے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی لیکن وہ صبر و شکر سے احکامِ خداوندی بجا لایا ہر طرح کی تکلیف برداشت کی اور دُنیا کے چپّے چپّے میں پھیل گیا اور آج جب اولادِ آدم پر وہ اِس طرح چھا چکا ہے کہ اُس کے بغیر وہ اس دنیا میں ایک پل بھی نہیں جی سکتی تو اُسی دانہ گندم نے خدا کے حضور گڑگڑا کے اپنے گُناہوں کی معافی مانگی اور خدا غفور الرحیم ہے خطاؤں کو بخشنے والا ہے۔ اُس نے گیہوں کی خطا معاف کر دی اور اُسے فوراً جنت آنے کی اجازت دے دی کہ وہی سب نیک و بد کی خبر رکھنے والا ہے۔

تو مومنو! —— اُسی معافی نامے کی بنا پر گیہوں دُنیا سے رختِ سفر باندھ رہا ہے۔ اور بہت ممکن ہے وہ عنقریب بالکل غائب ہو جائے اور اس کا ذکر صرف کتابوں میں ملے یا پھر چند دانے عجائب گھروں میں محفوظ کر لئے جائیں جنہیں تم اپنے نواسوں اور پوتوں کو دکھا کر بڑے فخر سے کہو کہ دیکھو ہم اسے کھایا کرتے تھے —— کہ مستقبل کی خبر صرف خدا رکھتا ہے —— تم اور تمہارے نجومی نہیں۔

تو اے جاہلو! اگر کچھ مانگنا ہی ہے تو اپنے خدا سے مانگو کہ رزّاق یعنی رزق دینے والا تو وہ ہے۔ اگر کسی وزیر کا نام عبدالرّزاق ہے تو اُس کے یہ معنی نہیں کہ اُس میں خدائی صفات بھی آ گئیں اور وہ تمہیں روزی روٹی بھی دے سکتا ہے! نہیں یہ کُفر ہے اور کُفر سے بچو، کہ خدا کافروں پر روزِ قیامت (جو عنقریب ہی آنے والا ہے) اپنا عذاب نازل کرے گا —— ! کہ وہی سب سے بڑی طاقت والا ہے!!

اور کیا نہیں سمجھ پائے تم اب تک کہ تمہارے پروردگار کے پاس اناج کی کمی نہیں لیکن اُس نے ہر ہر دانے پر کھانے والے کا نام لکھ رکھا ہے اس لئے اگر تمہارے حصّے میں صرف چند گلے سڑے گُھن لگے دانے آتے ہیں تو شکایت مت کرو کیونکہ ہو سکتا ہے صرف اُنہیں چند دانوں پر تمہارا نام لکھا ہو تم انہیں کھا کر شکر ادا کرو اور زیادہ کا لالچ مت کرو کہ خدا جو ہر چیز سے بے نیاز ہے، لالچ کو پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ اے مومنو! تم اپنے پروردگار اور اس کے نمائندوں

اس انداز کی عورتیں بستی ہیں اور ہمیں اپنے وطن پر بھی افسوس ہوا کہ یہاں ایسا مجسمہ بالکل برعکس شکل میں تیار ہو گا۔ اتنے میں ہماری بیوی کی ایک سہیلی مل گئیں اور انھوں نے اپنی شاپنگ کا ہماری شاپنگ سے موازنہ کیا اور چند خریداریوں کی سفارش کی۔ میری طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کون مہاشہ ہیں۔ بیوی نے میری بہن کا نام لیا اور کہا یہ اُن کے بھائی ہیں۔

اس نیک بخت کی نشاندہی پر چمڑے کا ایک سوٹ کیس خرید لیا گیا۔ اب جو ہم نے ایک اسٹال کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو ہنسی روک نہ سکے۔ وہ ہنسی جو انسان اپنے آپ پر ہنستا ہے۔ دونوں ہاتھوں میں دو تھیلیاں اور کہنیوں کے پاس مڑے ہوئے بازوؤں پر سوٹ کیس۔ ہماری ہنسی بہت کم عمر ثابت ہوئی کیونکہ فوراً ہی ہم رنجیدہ ہو گئے اور ہماری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، وہ آنسو جو انسان اپنے آپ پر بہاتا ہے۔ بیوی نے اپنی نومولود نواسی کے لئے دو کدو نما بیلون خریدے اور ہماری بے بسی پر ترس کھا کر ان بیلونوں کی ڈوریاں ہمارے بش شرٹ کے بٹن سے باندھ دیں۔ دفتر کے دو تین ساتھی ہمارے نزدیک پہنچ کر خوف زدہ لوٹ گئے کیونکہ ہماری ہیئت اسٹرو ناٹ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی اور شناخت کرنا یقیناً ناممکن تھا۔ اب جو اسٹال آیا تو بیوی صاحبہ جیسے بھول ہی گئیں کہ انکے پیچھے شاپنگ سے لدا ہوا ان کا بار بردار شوہر بھی کھڑا ہے۔ بچوں کے بش شرٹ، بچیوں کے شرٹ شلوار، خود اپنے لئے کشمیری ساڑی۔ ہماری طرف پلٹ کر مسکرائیں تو اخلاقاً ہم بھی مسکرائے۔ پوچھا آپ کو سبز رنگ پسند ہے نا؟ ہم نے اثبات میں گردن ہلا دی اور آرزوؤں کی دنیا میں کھو گئے۔ کبھی سبز رنگ کا بش شرٹ لہراتا ہوا آیا، کبھی سبز رنگ کا سوٹ جھولتا ہوا سامنے آویزاں ہو گیا۔ بیوی ہنستی ہوئی ہمارے قریب آئیں۔ کیوں جی، یہ پسند ہے نا.... اور ہم نے دیکھا ان کے ہاتھ میں ایک سبز رنگ کی مُنّی دستی ہماری محبتوں اور محنتوں کے انعامی تمغہ کی طرح تھمی ہوئی تھی..

ہم نے جھوٹ موٹ اظہارِ پسندیدگی کیا اور منہ پھیر کر اس دستی میں اپنا ایک ڈھلکتا ہوا آنسو اُتار لیا۔ اب جو بیوی کے نقشِ قدم پر ہمارا سفر شروع ہوا تو ایک عالمِ خود فراموشی طاری رہا اور بیوی کی نارنجی ساڑی کے سوا سارا ماحول احاطۂ نظر سے کٹ گیا۔ اچانک کوئی وزنی چیز ہماری پیٹھ سے ٹکرائی۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا تو بیوی بیگ کو گھماتی کھڑی نظر آئیں۔ ہم چکرا گئے ہمارے سامنے نارنجی ساڑی میں ملبوس ہماری بیوی خوش خرام تھیں۔ اور دوسری نارنجی ساڑی پشت کی طرف سے حملہ آور تھی۔ ہم قسمیہ کہتے ہیں کہ یکتائی میں دوئی کا یہ جلوہ ہمیں بیہوشی کی حدود تک پہنچا گیا۔ گھبرا کر ہم نے قدم آگے بڑھایا تو پیچھے سے ہمارا بش شرٹ پکڑ لیا گیا "اجی کدھر بھٹک لیے۔ ذرا چٹک مٹک چال ملی اور اس کے پیچھے روانہ۔ آئیے اب میرے ساتھ رہیے" ہم سنبھل گئے اور یہ دل شکن حقیقت ذہن پر چھا گئی کہ نارنجی ساڑیاں دو ہو سکتی ہیں لیکن بیوی تو ایک ہی ہو گی۔

لیکن اس چال کو ہم کیسے بھلائیں جس نے ہمارے پیروں میں جھنکارتی بجلیوں کی ڈور باندھ دی تھی۔ اب لکیر پیٹ رہے ہیں، سر بھی پیٹ رہے ہیں کہ چال اس غضب کی تھی تو صورت کیا قیامت ہو گی۔ واپس ہونے لگے تو بیوی نے کہا بھوک لگی ہے۔ کباب رولٹ کھانے کو جی چاہتا ہے چلو چار کماں چلیں" ہم اس وقت پیچش کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ اس لئے ان نعمتوں کا پرہیز تھا۔ بیوی کباب رولٹ اُڑا رہی تھیں اور ہم مقابل کا سائن بورڈ پڑھ رہے تھے۔ "اپنی تجہیز و تکفین کے وقت ہمیں یاد رکھئے۔ ہماری خدمات دن رات حاضر ہیں۔ عنبر و زم زم و گلال۔ ماہرِ فن، چابک دست غسّال، زرّیں شامیانہ کمخواب کا غلاف۔ آئیے اپنے جنازہ کی شان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے"۔ اور نہ جانے کیوں یہ خیال ہمیں چونکا گیا کہ شاپنگ کی ان ساری چیزوں کے ساتھ ہمیں زندہ سپردِ خاک کر دیا جائے تو اس ریاضت کی جزا میں یقیناً ہم سیدھے جنت پہنچ جائیں گے۔ چار کمان سے چُھٹے تو احتیاطاً ہم نے اپنے پرس کا جائزہ لیا۔ پتہ چلا پانچ سو روپیوں میں سے صرف دو سو روپے بچ رہے ہیں اور ان دو سو روپیوں میں پورا مہینہ طے کرنا ہے۔ ہمارا دم گھُٹ گیا لیکن ہم بہر حال زندہ ہے۔

ملک پیٹھ اسٹیشن کے قریب چکّی اور ہاون دستوں کا اسٹال بھی ملا۔ بیوی مچل گئیں کہ ایک چکّی اور ہاون دستہ ضرور ہی خریدنا چاہیے۔ چکّی نواسی کی شادی میں ہلدی پسائی کے لئے اور ہاون دستہ آئندہ بقرعید میں مصالحے کوٹنے کے لئے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ان چیزوں کی افادیت تو مستقل اہمیت رکھتی ہیں لیکن میں نے تیز لہجہ میں احتجاج کیا "یہ کیا کر رہی ہو میری گود میں یہ بوجھل چکّی کیوں رکھ رہی ہو۔ ارے ارے" بیوی ہنس پڑیں "اجی ہاون دستہ تو نیچے رکھ دیں گے لیکن چکّی ذرا نازک ہوتی ہے اس لئے آپ کی یہ نرم گود . . . ." دل میں روشنی کی ایک کرن کا اُجالا ہوا۔ شوہر سے زیادہ سنگین اور پائیدار دنیا میں کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔

یہ ہے ہماری شاپنگ کا قصہ۔ اس قصہ کے پس منظر میں کچھ اور بھی قصے ہیں جن سے یہ عبرتناک سبق برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) پہلی تاریخ کو بیوی اگر پری کا روپ بھی دھار لے تو شاپنگ کو نہ جائیں۔

(۲) شاپنگ سے پہلے دوکاندار کے آگے اپنی غریبی اور کثیر العیالی کا موثر اظہار کر لیں۔

(۳) دورانِ شاپنگ مزید رقم لانے کیلئے گھر جائیں۔ دکان کو واپس جانیوالا نتائج کا خود ہی ذمہ دار ہو گا۔ (۴) چیزیں "پسند ناپسند" لی جائیں تاکہ بیوی کی نظر بچا کر یہ چیزیں فوراً واپس کر دی جائیں (۵) خریداریوں میں امکانی تاخیر۔ کیونکہ فیشن جلد بدلنے لگے ہیں۔

یہ مشورے اُن بھائیوں کیلئے نہیں ہیں جن کو شادی سے پہلے منگیتر کے ساتھ شاپنگ کا عیش میسر ہوتا ہے۔

رشید قریشی
۱۶-۹-۲۳۶-اولڈ ملک پیٹ ،حیدرآباد

ہم نے بیوی کے ساتھ شاپنگ کی

پیدائش ۲۸ جون ۱۹۲۰ء تعلیم ایم اے۔ آندھرا پردیش سکریٹریٹ کے محکمہ جنگلات میں ایک اعلیٰ عہدہ [illegible] افسانوں کا مجموعہ "من کی دنیا" اور ریڈیو ڈرامے۔

مانئیے یا نہ مانئیے۔ ہم نے بیوی کے ساتھ شاپنگ کی اور اب تک صحیح وسالم زندہ ہیں۔ کمر خمیدہ ہوگئی ہے۔ سر کے بال جھڑ گئے ہیں یا چھت کو محبت تکتے تکتے چیخیں صادر ہوجاتی ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے یہ عارضے تو ہر شریف، ملنسار اور صلح پسند شوہر کو لاحق ہوتے ہیں۔ چاہے وہ بیوی کے ساتھ شاپنگ کو جانے والا شوہر ہو یا گھر بیٹھے شاپنگ کی مہم پر گئی بیوی کی راہ دیکھنے والا۔ البتہ سقراط کے مقیاس البرداشت کے مطابق بیوی کے ساتھ شاپنگ کرنے والا شوہر چونکہ موقعِ واردات پر موجود رہتا ہے اسلئے لازمی طور پر اس کے ضبط وتحمل پر غیر معمولی بوجھ لد جاتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس صورتِ حال کے زیرِ اثر ہماری حالتِ زار کچھ زیادہ ہی رقت انگیز بن گئی ہو۔ لیکن یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ شوہر کی ظاہری وجاہت کبھی بھی قابلِ اعتنا نہیں قرار پاتی۔ ہوتا ہے یہ ہے کہ شادی کے بعد شوہر کی لاعلمی میں اسکی ضعیفی غیر محسوس طور پر اسکی جوانی میں شامل ہوجاتی ہے، اور جب کبھی شوہر جوانی کو ڈھونڈنے بیٹھتا ہے ضعیفی اس کے ہاتھ لگتی ہے۔ اور جب وہ ضعیفی کو ٹٹولتا ہے تو جوانی ہا . . . جی نہیں یہاں شوہر کی قسمت میں مایوسی لکھی ہوتی ہے۔ جوانی کے بدلے ایک خرانٹ کھانسی اسکے گلے کا ہار بن جاتی ہے۔ بات [illegible] کہ شوہر، بیوی اور شاپنگ اپنی اپنی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کو ہرگز ہرگز خلط ملط یا ملط خلط نہ کیا جائے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ شوہر کی تباہ حالی شاپنگ کی وجہ سے ہے اور شاپنگ کے جو ڈھیر لگے ہیں تو وہ بیوی کی فضول خرچیوں کا اشتہار ہیں اور پانی کا پانی پت بن جائیگا۔ ہمارا نظریہ تو یہ ہے کہ جس طرح بیوی کی بقا کا انحصار شاپنگ پر ہے اسی طرح شوہر کی شوہریت کا دارومدار بھی شاپنگ ہی پر ہے۔

اس لئے ہم چلے بیوی کے ساتھ شاپنگ کو۔

نمائش (EXHIBITION) کی شاپنگ میں کئی فوائد ہیں۔ ایک تو یہ کہ ساری غیر ضروری چیزیں ایک جگہ جمی جمائی مل جاتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ جان پہچان کے سینکڑوں لوگ ملتے ہیں اور ان سب پر اپنی شاپنگ کا سکہ جمایا جا سکتا ہے۔ بیوی نے مون لائٹ میک اپ کیا۔ نارنجی رنگ کی ریشمی ساری زیبِ تن کی، نگینوں والا بیگ ہاتھ میں لیا اور فاتحانہ انداز سے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے باجگزار مسکراہٹ پیش کی تو تیوری بگڑ گئی۔ "آپ تو بس بچے بنتے ہیں۔ ہم کچھ سیر تماشے کے لئے نمائش جا رہے ہیں؟ ہمیں تو گھر کے لئے ضروری چیزیں خرید لانا ہے۔ یہ پھولدار بش شرٹ اتار دیجئے۔ وہ خاکی رنگ کا دفتر والا بش شرٹ ٹھیک رہے گا اور ہاں وہ دونوں بڑی تھیلیاں بھی لے لیجئے۔ سامان کس طرح آئے گا ورنہ"۔ ہم نے حکم کی تعمیل کی اور نمائش پہنچ گئے۔ جب کبھی ہم بیوی کے ساتھ نمائش جاتے ہیں نمائش ہم کو دیکھتی ہے۔ لیکن ہم اسکو دیکھ نہیں پاتے۔ ہماری نظریں بیوی کی نگاہوں کی تحویل میں رہتی ہیں اور ہم ایک تابعدار اے۔ ڈی۔ سی کی طرح ہمرکاب، اشاروں کو بھانپتے، ہر حکم کی تعمیل میں مستعد رہتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ برتنوں کے اسٹال پر رکیں۔ ڈنر سیٹ کی خوبصورتی پر تبصرہ ہوا، پھر جگ اور گلدان پسند کئے گئے۔ اس کے بعد ہم سے کچھ پوچھا گیا۔ ہم کسی اور دھن میں تھے انکے سوال کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ حسبِ عادت کہہ اٹھے "جی مناسب ہے"۔ بپھر گئیں۔ "چار عورتیں نظر آئیں اور آپ کے ہوش وحواس نو دو گیارہ۔ میں پوچھ رہی ہوں قیمت بہت زیادہ ہے نا۔ اور آپ فرماتے ہیں مناسب ہے۔ تو مناسب ہے تو چلئے خرید لیتے ہیں"۔ چھ کٹورے۔ چھ گلاس۔ دو گلدان اور دو کشتیاں خرید لی گئیں۔ بل بن گیا اور ادائی کے وقت ہمیں یہ حادثانہ احساس ہوا کہ قیمتیں نہایت نامناسب تھیں۔ جملہ ایک سو اسی (۱۸۰ روپیے) اسی پیسے۔ پہلی ہی ٹھوکر میں پیشانی زمین سے پیوست ہوگئی۔ ساری چیزیں احتیاط کے ساتھ تھیلیوں میں رکھی گئیں۔ اسٹال والے نے تجارتی مسکراہٹ کے ساتھ بیوی کا شکریہ ادا کیا اور ہم ایک جانباز شوہر کی طرح ان تھیلیوں کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیوی کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ دھیرے دھیرے تھیلیاں اپنا وزن منوانے لگیں۔ ہمارے شانے ڈھلنے لگے اور ہمیں اپنا قد کچھ اونچا ہوتا محسوس ہونے لگا۔

دو تین اسٹالوں کے بعد ہی ہماری رفتار سست پڑنے لگی اور ہم بیوی کے ہم قدم نہ رہ سکے۔ یہ ہونے لگا کہ وہ کہیں رک کر ہمارا انتظار کرتیں اور ہم ان تک پہنچ جاتے۔ اس اثنا میں ایک اطالوی مجسمہ بھی خرید لیا گیا، جس میں ایک طرف نہایت مسکین ادب شناس عورت ہے تو دوسری طرف نہایت خشمناک خود سر مرد۔ ہم نے دل میں سوچا مبارک ہے وہ ملک جہاں

میں "اب" ہم آفیسر معلوم ہوں گے۔ جہاں بھی ناس کی ڈبیہ نکالیں گے لوگ ڈبیہ کا لیبل پڑھ کر پہچان لیں گے کہ یہ "آفیسر" ہے۔ ورنہ صورت پر تو یہ نہیں لکھا تھا کہ ہم کوئی آفیسر ہیں۔ کیونکہ صورت بھی ایسی ہے کہ اس پر یہ لکھے بغیر چارہ نہیں۔

گھر پہنچ کر کپڑے بدل لینے کے بعد ہم نے اطمینان کے ساتھ ڈبیہ نکال کر کھولی اور اس میں سے ایک چٹکی بھر ناس نکالی۔ ہم نے بعض لوگوں کو جس انداز میں ناس چڑھاتے دیکھا تھا اسی ماہرانہ انداز میں چٹکی زور سے ناک میں چڑھائی۔ دوسرے لمحہ ہمیں محسوس ہوا کہ میز کرسیاں، دیگر سامان بلکہ پورا کمرہ اور سچ پوچھا جائے تو ساری زمین اور اس کے ساتھ خود ہم بھی فضا میں گھوم رہے ہیں۔ لڑکپن میں ماسٹر صاحب نے کئی مثالیں دیکر یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ زمین گھوم رہی ہے تب ہماری سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی۔ اب ہمیں خیال آیا کہ جغرافیہ کے ماسٹر صاحب مختلف مثالیں دے کر سمجھانے کی بجائے ایک چٹکی ناس کی ہر طالبِ علم کی ناک میں ٹھونس دیتے تو آسانی کے ساتھ مسئلہ ذہن نشین ہو جاتا۔ غرض کچھ دیر بعد زمین کی گردش رُکی اور ساتھ ہی تمام اشیاء اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگیں اور ہم بھی فضائے آسمانی کی سیر کر کے اپنے مقام پر صحیح و سالم واپس آ گئے تو شکر بجا لائے کہ ہم جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچے ورنہ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ کسی اور سیارے کی کشش میں داخل ہو گئے۔ جب ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو ہم نے دل میں کہا "اس شخص کا ستیاناس ہو جس نے ناس ایجاد کی۔"

تھوڑی دیر بعد ہمیں اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا ـــــ کہ ہمیں مبتدیوں کی چال چلنی چاہیئے تھی ـــــ اچانک اساتذہ کی صف میں جا بیٹھنے کی کوشش کی تو ہمارا حشر اس شاعر کا سا ہو گیا جو موسم گرما میں ایک جمعہ کی دوپہر کو ٹھیک بارہ بجے شاعری شروع کرتا ہے اور دوسرے جمعہ کی رات کے دس بجے اساتذہ کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس تلخ تجربے نے ہماری آنکھیں ہی نہیں بلکہ ناک بھی کھول ڈالی۔ اب ہم نے ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تجویز کو ہی مناسب سمجھا اور کچھ کھا کر سو رہنے پر غور کرنے لگے لیکن سامنے کھیلتے ہوئے معصوم اور ہونہار بچوں کو دیکھ کر ناک سے پانی بہنے لگا ـــــ بہت دیر تک غور کرنے کے بعد ہم نے جینے کا فیصلہ کر لیا اور جینے کے لئے ناس لینا گوارا کر لیا۔ اس کے بعد جس طرح دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے، ہم ناس "سونگھ سونگھ" کر لینے لگے۔ یعنی کہ بہت سوچ سمجھ کر لینے لگے۔ چٹکی میں ناس لینے کے بعد اس کی مقدار کو غور سے دیکھتے ـــ وہ زیادہ نظر آتی۔ کم کرتے پھر بھی زیادہ نظر آتی ـــ پھر کم کرتے۔ اس طرح آخر میں صرف چٹکی رہ جاتی اور ناس غائب ہو جاتی اب ہمیں اپنی بزدلی پر غصہ آتا اور دوبارہ چٹکی لیتے اور پھر کچھ کم کر کے کچھ مقدار چٹکی میں بچا لیتے ـــ اس کو غور سے دیکھتے ـــ بڑی احتیاط سے ناک کو لگا کر اندر کھینچنے کے بارے میں دو چار مرتبہ سوچ لیتے ـــ اور جب فیصلہ کر کے چڑھا لینے کا ارادہ کر لیتے تو سانس اوپر کھینچنے کی بجائے زور سے باہر چھوڑتے ـــ جس کی وجہ سے چٹکی کی ناس ہوا میں اُڑ جاتی۔ ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ ناس ہوا میں اُڑنے کی بجائے ہماری آنکھوں میں جا پڑی اور بہت دیر تک ہم روتے ہوئے نظر آئے ـــ بہر حال رفتہ رفتہ ہمیں ناس لینے کا سلیقہ آ گیا یا یوں کہئے کہ جینے کا ڈھنگ آ گیا۔

اس کے بعد چند اور ناگوار واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ناس لینے کے بعد اتنی چھینکیں آتیں کہ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور ساتھ ہی ہمارا دل بھی اندر ہی اندر رونے لگتا کہ زندگی میں جہاں اور کئی تلخیاں ہیں وہاں اس کمبخت ناس کی تلخی بھی شامل ہو گئی۔ اب ناس نے کچھ اور گُل کھلانے شروع کر دیئے۔ بعض وقت تو وہ ناک کی راہ سے حلق میں جا پہنچتی، جہاں ناس کی تلخی اور کڑواہٹ پھیل جاتی۔ اس کے بعد کھانسی آتی ـــ جو ہمیں تنگ بلکہ جینے سے بھی بیزار کر دیتی۔ رفتہ رفتہ بقولِ مرزا غالب ؏

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یعنی یہ کہ ہم ناس کے عادی ہو گئے تو چند دوسری باتوں سے وحشت ہونے لگی۔ ناک میں ہمیشہ ایک سیاہی مائل رقیق مادّہ جمع رہتا اور ہمیشہ ایک کپڑا جس کو "چیتھڑا" کہنا زیادہ موزوں ہوگا علاوہ رومال کے رکھنا ضروری ہو گیا۔ ناس لینے کے بعد جب نزلوی مادّہ ناک سے کافی مقدار میں خارج ہو جاتا اور آنکھوں میں نور اور ناک میں سرور آ جاتا تو پھر ناک کی صفائی ضرور ہو جاتی۔ بعض وقت اچانک ایک زور دار بلکہ فلک شگاف چھینک آ جاتی ہے تو دالان "پیش دالان" یا ڈرائنگ روم جہاں بھی ہم ہوں وہاں فرش پر ایک کثیف تودہ گر جاتا ہے۔ کبھی تو بستر پر لیٹے لیٹے ہی یہ حادثہ پیش آ جاتا ہے تو صاف ستھری لحاف اور شفّاف چادر پر گل کاری ہو جاتی ہے۔ کبھی بےخیالی میں سفید بش شرٹ پر سیاہ ریزش گر جاتی ہے تو پہننے کے دوسرے لمحے ہی اتار کر پھینک دیا جاتا ہے۔

آخر میں ہم "عوام النّاس" سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمارے حق میں دعائے "خیر النّاس" فرمائیں۔

■■

برق آشیانوی

۱-۵-۳۵۲ - مشیر آباد - حیدر آباد ۴۸ (آندھرا)

میں نے سکندر آباد کے انگلش اسکولس میں تعلیم حاصل کی۔ والد صاحب فارسی کے مسلّمہ استاد تھے۔ میں نے پوری منت اور عاجزی کے ساتھ کہا کہ میرا ارادہ تیل بیچنے کا نہیں ہے۔ پھر بھی انہوں نے اُردو کے ساتھ فارسی بھی پڑھا ڈالی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے پیشۂ تدریس سے منسلک ہو گیا۔ ٹیچرس ٹریننگ پاس کرنے کے بعد انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے کر شاندار ناکامی حاصل کی۔ لیکن کوئی طلائی تمغہ عطا نہیں کیا گیا۔ دل برداشتہ ہو کر اس پیشے کو خیر باد کہہ دیا اور جیل ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کر لی۔ ڈپٹی جیلر کی خدمت سے وظیفہ پر سبکدوش ہو کر اب بے چینی کی بنسی بجا رہا ہوں۔

میٹرک پاس ہونے کے بعد میری چیدہ چیدہ سنجیدہ تخلیقات "عالمگیر" لاہور، "ساقی" دہلی اور "ادب لطیف" میں شائع ہوئیں۔

جیل کی ملازمت اختیار کرتے ہی یکلخت لکھنا چھوڑ دیا۔ اچانک ۱۹۶۴ء میں سر کھجانے لگا تو مزاحیہ مضامین لکھنے لگا۔ میرے مضامین کا ایک مجموعہ "یہ ایک تبسم . . ." کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ ایسے اور کئی مجموعے کے مضامین الماری میں پڑے ہیں اور کبھی کبھی میرا منہ تک لیتے ہیں۔ اور ہاں یہ کہنا تو بالکل ہی بھول گیا کہ میں ۱۸۔ اپریل ۱۹۱۸ء کو سکندر آباد میں پیدا بھی ہوا تھا اور اب زندہ بھی ہوں۔ برق آشیانوی

نزلے نے جب بہت تنگ کر دیا، بلکہ جینا عذاب کر دیا تو ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب سے قدرے بے تکلفی تھی۔ وہ اپنے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ ظریف الطبع بھی واقع ہوئے تھے۔ ہم نے نزلے کی شکایت کی تو دریافت کیا ــــ "سگریٹ پیتے ہو؟" ہم نے کہا ــــ "نہیں"۔ پوچھا "کچھ اور پیتے ہو ــــ؟" عرض کیا "سونگھ کر بھی نہیں دیکھا" ــــ پھر پوچھا "کوئی درباری شغل کیا ہے ــ؟" کہا ــ "مطلب نہیں سمجھا ــ" تب ڈاکٹر صاحب نے مثال دے کر مطلب سمجھایا تو جواب دیا "اس فن میں بھی اناڑی ہیں"۔ پوچھا ــ "عمر کیا ہے ــ" ہم نے عمر بتا دی تو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ دریافت کیا ــ "اب اور کتنے سال جینے کا ارادہ ہے ــــ؟" عرض کیا "صورِ اسرافیل سُن کر دوڑنے کی سوچ رہا ہوں ــ" کہنے لگے "نہیں ــــ سنجیدگی سے بتاؤ ــ" ہم نے پوری متانت کے ساتھ جواب دیا ــ "بس اتنا کہ دو چار 'حوائجِ ضروری' سے فارغ ہو لیں ــ یعنی کہ ایسی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں جن کا بار تنہا ہمارے سر پر ہے ــــ تب بوریہ بستر باندھ لیں ــ" پھر سوال کیا ــ "کتنا عرصہ لگے گا ــ" ہم نے کہا "یہی کوئی پندرہ بیس سال اور بس ــ" تب انہوں نے کہا ــ "دیکھو بھئی 'حوائجِ ضروری' سے فراغت دلانا تو اللہ میاں کے ذمّہ ہے تمہارے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ لہذا میری بات مانو تو جاؤ اور آج بلکہ ابھی میں ایک دوا دیتا ہوں کھا لو اور چادر تان کر سو رہو ــــ سیدھے ملکِ عدم کی راہ لو ــــ عمرِ عزیز کا بیشتر حصّہ تو تم نے ابتک فضول ضائع کیا اور اب زندہ رہ کر کیوں اپنی ذات پر ظلم کرتے ہو ــــ!" اس پر ہمیں ہنسی آ گئی ہم نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب مذاق چھوڑیئے۔ اب اس نامعقول نزلے کا کچھ علاج کیجیے۔"

اس پر انہوں نے کہا ــ "ناس لینا شروع کر دو ــــ نزلہ بھاگ جائے گا ــ" ناس کا نام سُن کر ہم نے سوچا کہ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ان کے بتائے ہوئے پہلے علاج کو ہی قبول کر لیا جائے۔ پھر بھی کسی متبادل علاج کی خاطر ان سے پوچھا ــــ "کوئی اور ذریعہ نجات کا نہیں ہے ــــ؟" تو انہوں نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا ــــ "نجات کا بہترین ذریعہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں ایک نزلہ ہی نہیں زندگی کے مصائب و آلام سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی ــــ لیکن تم اس پر راضی نہیں ــ" ہمارے مزید اصرار پر انہوں نے فیصلہ کُن انداز میں کہا ــ "بس ناس لیا کرو ــــ اور کچھ نہیں ــــ پھر دیکھو۔"

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ہم نے ڈاکٹر صاحب سے رخصت چاہی اور گھر لوٹتے ہوئے دوکان سے شریان کی ناس کی ڈبیا خرید لی۔ ڈبیہ لے کر لیبل پڑھا تو دل خوش ہو گیا۔ اس پر لکھا تھا ــ "سربمان آفیسرس اسنف"۔ ہم نے محسوس کیا کہ حقیقت

دُور کرنا اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ وہ ہمارا کرایہ کیا لیں گے۔ بہت ہی ہوا تو یہی نا کہ وہ اپنی لڑکی کو لے جانے کی دھمکی دیں گے۔ ٹھیک ہے آج کے دَور میں لڑکی تو آسانی سے مل سکتی ہے مگر مکان نہیں مل سکتا چنانچہ ہم نے مالک مکان کے سامنے پوری سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ تب کہیں جاکر سر چھپانے کو جگہ ملی۔

ہم جس مشترکہ کرایہ کے مکان میں مقیم ہیں وہ کُل دو کمروں، ایک چھوٹے سے دالان اور ایک دیوان خانہ پر مشتمل ہے۔ ایک کمرے میں تو ہم مع اپنے اہل و عیال کے مقیم ہیں، دوسرے کمرے میں خود مالکِ مکان اپنی ایک ضعیف ماں، ایک بیوی، دو بیٹوں، تین بیٹیوں اور ایک شیر خوار بچے کے ساتھ رہتے ہیں۔ یوں تو کہنے کو مشترکہ دیوان خانہ ہے ضرور لیکن اس پر مکمّل طور پر مالکِ مکان کا غاصبانہ قبضہ ہے۔ جب کبھی ہم اس دیوان خانہ پر اپنا حق جتاتے ہیں تو مالکِ مکان فوراً بازو والی ہوٹل کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ہم وہاں فرصت کے لمحات گذار کر مفروض ہو جائیں۔ اسی طرح مشترکہ دالان بھی پورے طور پر ان ہی کے تصرّف میں ہے۔ اگر مالکِ مکان کا بس چلے تو وہ اس دالان کو بھی کرایہ پر اُٹھا دیں۔

ہم جس کمرے میں مقیم ہیں اس کے "باب الداخلہ" کا چوکٹھا اس قدر چھوٹا ہے کہ ہم جیسے مختصر آدمی بھی تن کر چل نہیں سکتے۔ شاید مالکِ مکان نے یہ چوکٹھا اس لئے چھوٹا بنوایا ہے کہ کوئی بھی کرایہ دار ان کے آگے تن کر نہ چل سکے۔ اب تک تو آپ نے "چھت ٹپکتی ہے" محاورہ سنا ہے۔ لیکن ہمارے کمرے کو ملاحظہ فرمانے کے بعد "چھت جھڑتی ہے" کہنا پڑے گا۔ چنانچہ ہم نے کبھی چھت کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں کی کیونکہ کسی وقت بھی چھت جھڑنے سے آنکھوں میں مٹی گر سکتی ہے۔ اسی کو آنکھوں میں دُھول جھونکنا کہتے ہیں۔ ہمارے اسی محتاط رویّہ نے ہماری گردن اس حد تک جھکا دی ہے کہ ہم آنکھ اُٹھا کر مالکِ مکان سے گفتگو نہیں کر سکتے۔ خیر گفتگو تو الگ رہی ہم اپنے کمرے میں چت لیٹ کر سو نہیں سکتے۔ ویسے کمرے میں آرام سے سونے کا اہتمام ہی کہاں ہے، ہمیشہ "و" (واؤ) بن کر سونا پڑتا ہے۔ اگر "ا" (الف) بن کر سونے کی کوشش کروں تو ٹانگیں مالکِ مکان کے کمرے کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہیں، اور کسی وقت بھی "مداخلتِ بے جا بہ خانۂ دیگر" کا الزام ہمارے سر تھونپا جا سکتا ہے۔ اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ چھت کی طرف ٹانگیں اُٹھا کر سو جائیں۔

مشترکہ مکان میں صبح اُٹھتے ہی جو مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے وہ مشترکہ دالان کی صفائی کے تعلق سے ہوتا ہے اور یہ مسئلہ راست خواتین کی ذاتِ بابرکات سے متعلق ہے۔ ہر خاتون اپنے کمرے کی حد تک تو جھاڑو لگاتی ہے لیکن دالان میں قدم رکھتے ہی اسکی بھویں تن جاتی ہیں گویا اسکا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کون کس حد تک جھاڑو لگائے۔ چنانچہ روزانہ کی اس جھک جھک سے بیزار کر ہم لوگوں نے مکان کے دالان میں کوئلہ سے سرحدوں کا تعین کر لیا ہے کیا مجال کہ جھاڑو لگاتے وقت کوئی خاتون ایک ملی میٹر کی خلاف ورزی کرے۔ اتنی سختی سے پابندی کرتے ہوئے ہم نے خواتین کو کسی اور معاملہ میں نہیں دیکھا ہے۔

مشترکہ مکان میں رہ کر ایک کرایہ دار بالکل ہی بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب دیکھئے بھی ناکہ ہم گھر میں رہ کر بھی بالکل بے گھر سے ہیں۔ نل پر نہانا تو کجا منہ ہاتھ تک دھو نہیں سکتے۔ اگر ہم گھر کے نل پر منہ ہاتھ دھونے کے لئے اپنی باری کا انتظار کریں تو دفتر میں لیٹ ہو کر ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اس لئے نہانے اور دھونے کے کاروبار پبلک نل پر انجام پاتے ہیں۔ اگر پبلک نل پر بھی کبھی کیو لمبی ہو جاتی ہے تو ہم مسجد کا سہارا لیتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اب ہم رفتہ رفتہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ تو بوقتِ حشر ہی پتہ چلے گا کہ ہماری نمازیں آیا قبول ہوئیں یا نہیں۔ کہنے کو مکان میں ایک مشترکہ بیت الخلا بھی ہے لیکن ہم اس کے تمام متعلقہ اُمور سے باہر ہی نجات حاصل کر لیتے ہیں چنانچہ اسی وجہ سے ہم گھر پر کبھی جُلاّب کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ پیچش کا نام سنتے ہی ہم یوں بدکتے ہیں جیسے کسی نے دیوانے کتّے کی آمد کی اطلاع دی ہو۔

یہ تو صرف ہماری ایک ذات کی حد تک کی مجبوریاں تھیں۔ اب آپ ہماری دوسری مجبوریاں سُنیں گے تو ہم پر لعنت و ملامت شروع کر دیں گے اور کہیں گے کہ اس شخص میں اخلاقی جرأت نام کو نہیں۔ کیا کروں۔ زمانہ ہی کچھ ایسا آگیا ہے کہ ایک انسان مشترکہ مکان میں رہ کر اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرے تو اُلٹا اسے لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ مالکِ مکان نے اپنی بیوی کی تائید میں اپنی بوڑھی ماں کو بُری طرح زدوکوب کرنا شروع کر دیا، وہ بیچاری پہلے ہی سے بخار کی بھٹی میں جھلسی جا رہی تھی اور مالکِ مکان کی زدوکوب "مرے پر سو دُرّے" کے مصداق تھی۔ یہ دیکھ کر ہماری رگِ انسانیت پھڑک اُٹھی۔ ہم نے اپنی پچھلے تجربات کی روشنی میں اپنی رگِ انسانیت کو پھڑکنے سے روکنا بہت چاہا۔ لیکن اخلاقی جرأت کا غلبہ اس قدر ہوا کہ اس کے آگے ہماری ایک نہ چل سکی۔ ہم عدمِ تشدد کا پرچم اٹھائے آگے بڑھے۔ مالک مکان نے ہمیں دیکھتے ہی بُری طرح جھڑک دیا۔ "آپ کو ہمارے خانگی معاملات میں دخل انداز ہونے کا کوئی حق نہیں۔" ہم نے قدرے غصیلی آواز میں کہا "ارے واہ!

مسیح انجم
۱۹۷-۴-۲۷ - بڑا بازار - یاقوت پورہ - حیدرآباد ۲۳ (آندھرا)

مشترکہ مکان

—— یہ جو تصویر آپ دیکھ رہے ہیں وہ صدفی صد میری ہے - البتہ "اسٹائل" فوٹوگرافر کے ڈائرکشن کا نتیجہ ہے اور "ٹائی" فوٹو اسٹوڈیو کی جہرے پر جو ڈاڑھی ہے وہ نقلی نہیں ہے -
میرا نام محمد مسیح الدین ہے - لیکن مسیح انجم کے نام سے مزاح لکھتا ہوں، ۶ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو تعلقہ سدی پیٹھ ضلع میدک کے ایک چھوٹے سے گاؤں ویلکٹور میں پیدا ہوا -
میں نے سدی پیٹھ ہائی اسکول سے میٹریکولیشن کی تکمیل کی اور حیدرآباد میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگیا - بعد میں میں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی - اے اور بی ایڈ کے امتحانات کامیاب کئے - میری ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۷ء سے ہوا - میری مزاحیہ نگاری کو پروان چڑھانے کے لئے "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے منفرد طنزیہ و مزاحیہ ماہنامہ "شگوفہ" نے اہم حصہ ادا کیا ہے (اب تو میں اس کی مجلسِ ادارت کا ایک رکن بھی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ "زندہ دلانِ حیدرآباد" کا نائب معتمد بھی) - میرے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "سائڈ سے چلیے" ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا -
مسیح انجم

موجودہ دور میں غمِ روزگار کے بعد اگر کوئی غم ہے تو وہ ہے غمِ مکان - ایک حد تک غمِ روزگار کا پھر بھی مداوا ہو سکتا ہے - اگر آپ واقعی بے روزگار ہیں اور محنت مزدوری سے جی چُراتے ہیں تو کسی چوراہے پر اپنے رومال کو پھیلا کر کھڑے ہو جائیں اور "مائی باپ، ایک پیسہ —!" کی رٹ لگائیں تو کچھ ہی دیر میں سو پچاس جھڑکیوں کے ساتھ ساتھ بیس پچیس پیسے مل ہی جائیں گے، یا ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ روزانہ پورے شہر کا ایک جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کہاں کہاں شامیانے لگے ہیں اور کس مکان سے دھواں اُٹھ رہا ہے - مگر کبھی کبھی یہ دھواں دھوکا بھی دے جاتا ہے جس کے نتیجہ میں پیٹ کی آگ بجھانے کی بجائے گھر کی آگ بجھانے کی نوبت آجاتی ہے - لیکن ایسا واقعہ شاذ و نادر ہی پیش آتا ہے - جب اس طرح کے سروے میں جہاں کہیں شامیانے لگے ہوئے نظر آئیں تو فوراً بن بلایا مہمان بن کر اندر گھس جائیں اور خوب "ڈٹ" کر کھائیں - اگر "موقعِ واردات" پر میزبان پکڑ لے تو فوراً جھڑک دیں - "آپ کو دسترخوان کے آداب کا کچھ لحاظ ہے؟" یہ حربہ اگر ناکام ہو جائے تو فوراً حیدرآبادی آداب و روایات کا حوالہ دیں - کیونکہ یہ حربہ اکثر خطرناک موقعوں پر نہایت ہی کارگر ثابت ہوا ہے - ظاہر ہے اس حربہ کی تاب نہ لا کر میزبان وہیں ڈھیر ہو جائیگا - اور اُلٹا معذرت چاہ لے گا - کیا عجب کہ ساتھ ہی مزید کچھ اچھے کھانوں سے آپ کی ضیافت کرنے پر اُتر آئے - لیکن مکان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے - اگر آپ مکان کی تلاش کرتے کرتے نڈھال ہو جائیں اور رات ہونے پر کسی مکان میں گھس جائیں تو مالک مکان آپ کو حوالات کے حوالے کر کے ہی اطمینان کا سانس لے گا - اگر آپ اس وقت حیدرآبادی آداب و روایات کا حوالہ دیں تو دو چار زبردست گھونسے جڑ کر کہے گا "یہ بھی حیدرآباد کی روایات میں داخل ہے!" اس طرح روزگار سے کہیں زیادہ مکان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے - کیونکہ فٹ پاتھ پر سونے سے تو رہے - وہاں داداؤں سے سابقہ پڑتا ہے - گلی کوچوں کے چبوتروں پر سوئیں تو پولیس کے دھر لینے کا خوف - مسجد میں موذن کا اقتدار، مندر میں پجاری کا اجارہ - ان حالات میں ایک انسان سوائے مکان کے کہیں اور نہیں رہ سکتا -

چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر جب ہم نے مکان کی تلاش میں کوچہ نوردی شروع کی تو جوتوں کے پھٹنے کا ایک اور غم شاملِ حال ہو گیا - قبل اس کے کہ ہم غموں کے بوجھ تلے دب کر "کُوبڑے" بن جاتے، شاید خدا کو رحم آیا اور ایک دوست کی سفارش سے سر چھپانے کے لئے ایک مشترکہ مکان میں ایک کمرہ مل گیا - مگر اس مکان میں کمرہ حاصل کرنے کے لئے ہمیں کئی پاپڑ بیلنے پڑے - سب سے پہلے ہمیں شادی کر کے ایک اور مصیبت اپنے گلے ڈال لینی پڑی کیونکہ مشترکہ مکان میں کنواروں کا داخلہ ممنوع ہے - نہ صرف ہمیں شادی کرنی پڑی بلکہ مالک مکان کے بےحد اصرار پر ان کے آگے "سیہ نامہ" پیش کرنا پڑا، تاکہ شادی کے "بوگس" ہونے کا شبہ رفع ہو جائے - یہی نہیں ہمارے کیرکٹر اور تنخواہ وغیرہ کے بارے میں اتنی ساری پوچھ گچھ کی گئی کہ ہمارے سسرالی رشتہ دار ہمارے تعلق سے عجیب و غریب شک و شبہات میں مبتلا ہو گئے - ہم نے ان کے شبہات کو

سیّدہ جعفر
"ایلیا" لنگر حوض۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۸ (آندھرا)

نظم میں طنز و مزاح کے نئے رُجحانات

آج ہماری تہذیبی، اخلاقی اور سماجی زندگی، تیز رفتار تبدیلیوں، تہہ دار پیچیدگیوں اور معاشرتی روابط کے مسلسل تغیرات اور الجھنوں کی زد میں ہے۔ تمدّنی زندگی کے اس دباؤ اور ہیجان خیز کیفیت نے فکر و احساس کو مختلف زاویوں سے متاثر کیا ہے۔ زندگی کی گہماگہمی اور عدیم الفرصتی نے "فرصتِ کاروبارِ شوق" ہی کو نہیں "ذوقِ نظارۂ جمال" کو بھی متاثر کیا ہے۔ عام آدمی اس بھاگ دوڑ میں اپنے اِردگرد پھیلی ہوئی معاشرتی زندگی کے بہت سے مسائل پر توجہ کرنے اور ان کی کجروی اور ناہمواری کا تجزیہ کرنے کی طرف زیادہ مائل نظر نہیں آتا۔ مزاح و طنز نگار ہمارے ذہن کو ان مسائل پر صحت مندانہ انداز میں سوچنے کی ترغیب دیتے، ہمارے خوابیدہ احساسات کو بیدار کرتے، فہم و ادراک کو جلا دیتے اور تنقیدِ حیات کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ ہر معاشرے میں طنز و مزاح قومی مزاج اور زبان و اسلوب کے مخصوص اصولوں کے تحت فروغ پاتا اور وقت کے ترنّم پر رقص کرتا رہتا ہے۔ سماج میں ثقافتی اور عصری رجحانات طنز و ظرافت کے معیار مقرر کرتے اور ادب میں اُن کے علائم اور ابلاغ و ترسیل کے وسیلوں پر مہرِ قبولیت ثبت کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد میں طنز و مزاح کے ادبی پیکر اور سانچے بدلتے رہے ہیں۔ ضلع جگت، جلی کٹی، ہزل گوئی، ہجو، پھبتی، تمسخر و استہزا، چٹکلے بازی اور لطیفہ گوئی کے دور سے گذر کر اب اردو ادب طنز و مزاح کی نئی منزلوں کی طرف گامزن ہے۔

"اودھ پنچ" نے اردو شاعری کو طنز و مزاح کا ایک نیا انداز عطا کیا۔ کارٹون کی پیش کشی کا سہرا بھی انہی ظریف فنکاروں کے سر ہے۔ "اودھ پنچ" کے شعرائے مزاح کے پردے میں اپنے عہد کی بے راہ روی، بے اعتدالی اور غیر متوازن سماجی اور ثقافتی رویے کو ہدفِ تنقید بنایا تھا۔ آسکر وائلڈ نے کہا تھا "اگر کسی سے سچی بات کہلوانی ہو تو اُسے ایک نقاب دے دو"۔ ظرافت ایسی ہی ایک نقاب ہے۔ "اودھ پنچ" کے شاعروں نے فرد کی کمزوریوں اور لغزشوں پر تنقید کر کے اُسے خود آگاہی کی طرف مائل کیا۔ ان کی شعری تخلیقات میں سماجی شعور اور زندگی کی قابلِ احترام قدروں کا احساس ضرور موجود تھا لیکن وہ اپنے مزاح میں توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ اکبر الہ آبادی کی ادبی کاوشیں، طنز و ظرافت کی راہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے اُردو شاعری میں مزاح کے ایک نئے رُجحان کا اضافہ کیا اور اُسے درجۂ کمال تک پہنچایا۔ اُس وقت ہندوستانی سماج میں تہذیب و تمدّن، فلسفہ و اخلاق اور شعور و ادراک میں نئے اور پُرانے کی تفریق پہلی مرتبہ پوری شدّت کے ساتھ ابھری تھی۔ ہر سوسائٹی شکست و ریخت اور تعمیر کی اس کٹھن منزل سے گزرتی ہے۔ اُس وقت قدیم تصورات کے متبعین بڑی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس لئے کہ نئی نسل کے لئے یہ "ایک جام اور" کا سوال ہوتا ہے جبکہ قدیم کلچر کے رسیا، ترک و اختیار اور ردّ و قبول کی الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اکبر اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اخلاقی اقدار، تہذیبی میلانات اور تاریخی محرکات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کے یہاں طنز و مزاح کی وہ گمبھیر کیفیت نہیں جو "خالص ذہانت" کو متاثر کر سکے اور جو برگساں کے الفاظ میں مزاح کا ترقی یافتہ روپ ہے۔ اس کے باوجود اکبر کا یہ کارنامہ کچھ اہم نہیں کہ انہوں نے غیر متوازن جدّت پرستی، غلامانہ ذہنیت، انتہا پسندی اور کورانہ تقلید کے بے مہار جذبے پر طنز و مزاح کے ذریعہ سے قابو پانے کی کوشش کی۔ اکبر کا فن وِٹ (Wit) کی طرف زیادہ مائل تھا اور اسی کے وسیلے سے انہوں نے اپنے طنز و مزاح کو تقویت پہنچائی ہے۔ اکبر کے اکثر اشعار لفظی ظرافت کے اچھے نمونے ہیں۔ روزمرّہ زندگی میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ کے مضحک پہلوؤں کو انہوں نے خوب جانچا اور پرکھا لیکن اعلیٰ ظرافت الفاظ کی بازی گری اور الٹ پھیر کی زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی۔ وہ تعمق و تفکر کی پروردہ ہوتی ہے ورنہ بین (BAN) کے الفاظ میں وہ "لفظوں کا کھیل" بن کر رہ جائے گی۔ اکبر کے ان اشعار میں معنویت اور گہرائی نظر آتی ہے جن میں نئے علائم (SYMBOLS) اور پرانی علامتوں کے لئے نئے اطلاقات کی مدد سے انہوں نے اپنے تہذیبی شعور کا اظہار کیا ہے۔ اکبر کی ظرافت کا حسن اُنکی مرصّع کاری، اچھوتی تشبیہات، ان کے مخصوص قوافی اور انگریزی الفاظ کے برمحل استعمال میں پوری طرح اُجاگر ہو سکا ہے۔

یہ بھی کوئی بات ہوئی، ہم تو پڑوسی ہیں۔ یہ ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔"
مالکِ مکان نے ہمارے اس جملہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "اگر آپ واقعی ہمارے پڑوسی ہیں اور ہم سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو بڑھیا کے علاج کے لئے دو سو روپے دیجیے۔" یہ سُنتے ہی ہماری اخلاقی جُرأت پوری کی پوری منجمد ہوگئی اور ہم بارِ ندامت سے سر جُھکائے اپنے کمرے کی طرف چلے آئے۔

مخلوط وزارت اور مشترکہ مکان میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح ایک بڑا سیاست داں یا نجومی یہ حکم نہیں لگا سکتا کہ مخلوط وزارت کب ٹوٹے گی، بالکل اسی طرح یہ کوئی بھی دعوے کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ "مکان خالی کرو" کی دھمکی کب دی جائیگی۔ بہ الفاظِ دیگر "مکان خالی کرو" کی ننگی تلوار ہمیشہ سروں پر لٹکتی رہتی ہے۔ اب ان دو واقعات سے آپ کو پتہ چلے گا کہ کس طرح مالکِ مکان نے ایک بے سروپا موضوع کو مکان کے تخلیہ کا موضوع بنایا تھا۔ ایک دن ہمارے پاس مرغ کا سالن پکایا جا رہا تھا۔ سارے کا سارا مکان اس کی مہک سے مُعطّر ہو رہا تھا۔

عین اُسی وقت مالکِ مکان اپنے کمرے سے دندناتے ہوئے آئے اور آتے ہی وارننگ دی ۔ "مکان خالی کرو" ہم نے پوچھا "حضور ہمارا قصور؟" انہوں نے ترشروئی سے جواب دیا "قصور وصور کچھ نہیں، بس مکان خالی کرو۔ آپ کی وجہ سے ہمارے گھر والے تمام کے تمام چٹورے بنتے جا رہے ہیں۔" ہم فوراً بات کی تہہ کو پہنچ گئے اور بغیر کسی حجّت کے معذرت چاہ لی اور سالن تیار ہوتے ہی ایک کٹورا سالن مالکِ مکان کے ہاں بھجوا دیا۔ اب تو ہمارا یہ اصول سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی ہمارے گھر میں کوئی اچھا سالن بن جاتا ہے تو ہم فوراً ایک کٹورا سالن مالکِ مکان کو بطورِ "خراج" بھجوا دیتے ہیں جسے آپ کی اصطلاح میں "معمول" کہہ سکتے ہیں۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ایک بار پھر وہ اسی طرح دندناتے ہوئے آئے اور آتے ہی مکان خالی کرنے کی دھمکی دی۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "اب آپ کو ہم لوگوں سے کیا شکایت ہے؟" بولے "آپ کی بیوی صاحبہ بہت زیادہ فیشن کرتی ہیں جس کی وجہ سے میری بیوی آپ کی بیوی کے حوالے سے طعنے دیا کرتی ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ مکان خالی کر دیجیے تاکہ ۔ ۔ ۔!" ابھی وہ "بانس اور بانسری" کا حوالہ دینے بھی نہ پائے تھے کہ ہم نے جھٹ کہا ۔ ۔ ۔ "ٹھیک ہے قبلہ! آئندہ سے میری بیوی پیوند کی ساڑیاں استعمال کریگی اپنے چہرے پر خاک اور دھول اُڑالے گی۔ آپ مطمئن رہیں! ۔ ۔ ۔"

ہماری یہ عادت بھی ہے کہ ہم کبھی کبھی کوئی اچھی سی فلم ضرور دیکھ لیتے ہیں۔ ایک دفعہ ہم سیکنڈ شو دیکھ کر مکان لوٹ رہے تھے کہ "مین گیٹ" پر مالکِ مکان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ برس پڑے۔ "جناب! آپ کی اس آوارگی اور فلم بینی کی عادت کی وجہ سے ہمارے لڑکے شُہدے بنتے جا رہے ہیں!" دیکھا آپ نے۔ انہوں نے راست اپنے لڑکوں کو گالی نہیں دی تھی بلکہ اُن کے توسط سے ہماری عزّت پر حملہ کیا تھا، اس وقت جی میں کہ فوراً زبان کھینچ لیں اور چہرہ نوچ ڈالیں مگر تخلیۂ مکان کے تصوّر سے لرز کر رہ گئے۔

ان تمام حالات نے اور مکان کی گُھٹن نے ہمیں قبل از وقت بوڑھا بنا دیا ہے، ہمارے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں اور اعضا میں اعتدال نہیں ہے، ہمیشہ ہمارے چہرے سے وحشت برستی رہتی ہے، مختصر یہ کہ غالب کا یہ شعر ہم پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب — اب عناصر میں اعتدال کہاں

چنانچہ ایک دن جب ہمارے ایک بچپن کے ساتھی سے ایک طویل عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تو اُس نے تعجّب سے پوچھا "ارے یار! یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے، کیا تم کسی موذی مرض میں مبتلا ہو گئے ہو؟" ہم نے ایک آہِ سرد کھینچ کر کہا "نہیں یار! میں کسی مرض ورض میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ میں مشترکہ کرایہ کے مکان میں رہتا ہوں!"

ہند، بنگلہ دیش اور پاکستان میں مفاہمت

۹ - اپریل ۱۹۷۴ء کو دلّی میں ہند، بنگلہ دیش اور پاکستان کے وزرائے خارجہ کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا جس کے تحت پاکستان بنگلہ دیش میں مقیم پاکستانی شہریوں کو واپس لے لے گا اور ۱۹۵ پاکستانی جنگی مجرم پاکستان بھیج دیئے جائیں گے۔ ہند اور پاکستان کے درمیان ایک اور سمجھوتہ ہوا جسکی رو سے ہند اور پاکستان سارے جنگی اور شہری نظر بندوں کا تبادلہ کرلیں گے۔ علاوہ ازیں دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات بحال ہونے کے بھی روشن امکانات ہیں۔
آئندہ شمارے میں اِس سمجھوتے پر ایک خصوصی مضمون ملاحظہ فرمایئے۔

ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ترقی پسند شاعروں نے ہیئت اور ٹکنیک کے نئے تجربوں کو اپنی شاعری میں جگہ دی تھی آزاد نظم پر انہوں نے بطورِ خاص توجہ کی تھی۔ اس لئے کہ اس میں ردیف وقوافی کی کڑی بندشوں کو جو خیال کی آزاد روی میں رکاوٹ ثابت ہوتی تھیں، درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا تھا جس کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ روایتی شاعری میں ردیف وقافیہ سے جو صوری حُسن اور ترنم پیدا کیا جاتا تھا وہ الفاظ کے آہنگ (CADENCE) اور ان کی برجستہ جھنکار کے ذریعے بھی ممکن تھا۔ بعض انتہا پسند شاعروں کے یہاں جنسی حقیقت نگاری کی اتنی بہتات اور جدّت پرستی کے غلط تصور میں فنّی لوازم اور شاعری کی ہیئتی، صوتی خوبیوں سے اتنی غفلت برتی گئی تھی کہ طنز نگاروں نے اس بے اعتدالی پر انہیں ٹوکا اور ان کے مخصوص طرزِ ادا، لفظیات، ان کی سہل انگاری، گنجلک ابلاغ اور علائم کے ابہام اور اجنبیت کے آئینے میں انہیں ان کے فن کا عکس دکھایا تاکہ وہ اس کے خدوخال کے بھدّے پن کو محسوس کر سکیں۔ کنہیا لال کپور نے "غالبؔ جدید شعرا کی مجلس میں" لکھا جس میں جدید شاعری پر طنزیہ نظمیں بھی تھیں۔ سید محمد جعفری اور فرقتؔ کاکوروی کی کاوشیں بھی اس سلسلے میں اہمیت رکھتی ہیں۔

راجہ مہدی علی خاں، دلاور فگار، واہیؔ، ماچس لکھنوی، راہیؔ قریشی، مائلؔ لکھنوی اور ہلالؔ سیوہاروی ایسے شعرا ہیں جنہوں نے مزاح نگاری میں اپنی انفرادیت منوائی ہے۔ واہیؔ، خضر تمیمی، کپورا، پروفیسر عاشق محمد غوری اور پنڈت ہری چند اخترؔ نے پیروڈی لکھنے میں بڑی ذہانت، جودتِ طبع اور پختہ فنّی شعور کا ثبوت دیا ہے۔

پیروڈی کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ جس تخلیق پر توجہ مرکوز کی جا رہی ہو وہ اتنی مقبول اور مشہور ہو کہ قاری کا ذہن اصل کی طرف فوراً رجوع ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی اور اردو میں صرف چوٹی کے شعرا اور قد آور ادیبوں کی تخلیقات کو پیروڈی کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ فیضؔ کی نظم "تنہائی" کی پیروڈی کنہیا لال کپور نے اس طرح کی ہے:

فون پھر آیا دلِ زار نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اُترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلّا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامنِ فرسودہ کے بوسیدہ چراغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

میرؔ، غالبؔ، ظفرؔ اور داغؔ کی مقبولِ خاص وعام غزلوں کی بھی پیروڈیاں لکھی گئی ہیں۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی مشہور غزل:

لگتا نہیں ہے دل مِرا اُجڑے دیار میں ... کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

کی راجہ مہدی علی خاں نے اچھی پیروڈی لکھی ہے۔

اکثر صورتوں میں پیروڈی کا محرک اصلاحی مقصد رہا ہے۔ غالبؔ کی طرزِ بیدلؔ کی قیامت سے ان کو بعض ہم عصر شاعروں نے تحریف کے ذریعے سے واقف کرایا تھا اور اُن کی مشکل پسندی اور تعقیدِ معنوی سے انہیں نجات دلانے کی کوشش کی تھی۔ موجودہ دَور کے ظریف شاعروں کے یہاں اسی اصلاحی مقصد کی جھلک موجود ہے۔ یہ پیروڈیاں اس لئے گراں نہیں گذرتیں کہ مزاح وانبساط کی رنگ آمیزی نے ان کو دل کش اور نشاط پرور بنا دیا ہے۔ واہیؔ اپنی پیروڈی میں طنز و مزاح، دردمندی اور اصلاحی عناصر کے خوبصورت امتزاج سے ایک ایسا تاثر تخلیق کرتے ہیں جو خیال آفریں ہوتا ہے۔ جوشؔ نے اپنا نجی پروگرام ادبی دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا تھا ع

اے شخص اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈنا چاہے ... وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی ... کوئے ہُنر و شہرِ ادیباں میں ملے گا

اس پروگرام سے متاثر ہو کر واہیؔ نے شاعر، لیڈر، ملّا، افسر اور خود اپنا پروگرام پیش کیا ہے۔ لیڈر کا نظام الاوقات دعوتِ قہقہہ بھی دیتا ہے اور دعوتِ فکر بھی ع

لیڈر کو اگر آپ کہیں ڈھونڈنا چاہیں ... وہ پچھلے پہر حجرۂ دلبر میں ملے گا
اور صبح کو وہ بندۂ اغراض و مقاصد ... سر خم کئے دربارِ منسٹر میں ملے گا
اور دن کو وہ جنتا کی چراگاہ کا بھینسا ... چرتا ہوا پرمٹ کسی دفتر میں ملے گا
اور شام کو احباب کے پیسوں کی بدولت ... ہوٹل میں کہیں یا کسی پکچر میں ملے گا

واہیؔ نے ہمارے دَور کی تعلیمی، سماجی اور اخلاقی کوتاہیوں کو محسوس کیا ہے۔ خارجی محرکات ان کے لب ولہجے کی حلاوت، سماجی شعور اور انسان دوستی سے مل کر اُن کو انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ واہیؔ کی نظموں کی تصویریت (PICTUREQUNESS) اور ایمائیت SUGGESTIVITY ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

پیروڈی وہ صنفِ ظرافت ہے جس میں کسی کے طرزِ ادا کی تقلید کر کے اسلوب یا خیال کو مزاح کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ اُردو میں پیروڈی کے لئے کوئی ایسا لفظ اصطلاحاً استعمال نہیں ہوتا جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر سکے یہ ایک طرح کی مضحک نقّالی یا خاکہ اُڑانا ہوتا ہے جس کو تقلیدِ

انیسویں صدی کی تیسری دہائی تک پہنچتے پہنچتے "اودھ پنچ" کا شیرازہ بکھرنے لگا اور حکیم ممتاز حسین عثمانی کے لئے اس کو جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔ ان حالات میں ۱۹۳۱ء میں "سرپنچ" جاری ہوا اور بہت جلد اس نے اپنے کالموں، کارٹونوں اور مزاحیہ تخلیقات سے اُردو داں طبقے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ظریف لکھنوی، چودھری محمد علی شہباز اور احمق پھپھوندوی وغیرہ نے "سرپنچ" کی آبرو رکھ لی۔ ان فنکاروں میں ظریف کا کلام اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ظریف لکھنوی کا مزاحیہ کلام "کلامِ ظریف" "مزاحِ ظریف"، "ظرافتِ ظریف" اور "قربانِ ظریف" کے عنوانات سے شائع ہوا کرتا۔ "سرپنچ" سالِ نو کے موقع پر "سرپنچ گزٹ" شائع کرتا جس میں شعراء کو خطابات دیئے جاتے تھے۔ ظریف کے لئے "ملک الشعرا" کے خطاب کی تجویز سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ "سرپنچ" کے مزاح نگاروں میں اُن کا کیا مقام تھا۔ ظریف کی طبیعت میں بلا کی شوخی اور ظرافت تھی۔ ان کے طنزیہ اشعار کا لب ولہجہ نرم، تیکھا اور پُر اثر ہے۔

"اودھ پنچ" کے بعد ہمارا مزاح ایک نئے دَور میں داخل ہوتا ہے شبلی، ظفر علی خاں اور ریاض خیرآبادی اور اقبال کی شاعری ایک نئے رجحان کا پتہ دیتی ہے۔ ان کے اشعار اردو کے مزاح اور طنز میں ایک خوشگوار اضافہ ہیں۔ طنز کی کاٹ مزاح اور وٹ سے زیادہ تیز اور خطرناک ہوسکتی ہے کیونکہ اس کا اوچھا وار خود شاعر اور ادیب کو گزند پہنچا سکتا ہے۔ شبلی میں وہ نفاستِ مذاق اور وہ ذہانت موجود تھی جس نے طنز نگاری میں اُن کی اچھی رہبری کی۔ شبلی کے تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی تصورات کے صحیح یا غلط ہونے سے بحث کی جاسکتی ہے لیکن ان کے طنز کی نشتریت کے متعلق دو رائیں نہیں ملتیں۔ ظفر علی خاں اور اقبال کے طنزیہ اشعار میں سیاسی اور تہذیبی مظاہر پر چوٹیں ہیں۔ اقبال کا نقطۂ نظر فلسفیانہ بصیرت، ژرف نگاہی اور نکتہ رسی کا مظہر ہے۔ ان کے طنز کی تان انسان دوستی، اصلاح پسندی اور آفاقی تصوّرات پر ٹوٹتی ہے۔ وہ "تہذیبِ حاضر" کو "انسانیت کے جوہر" سے محروم نہیں دیکھنا چاہتے تاکہ "زاغوں کے تصرّف" سے "عقابوں کے نشیمن" بچے رہیں۔ ظفر علی خاں اور اقبال اپنی شاعری میں نشتر زن بھی نظر آتے ہیں اور مرہم ساز بھی۔ وہ "بتانِ عصرِ حاضر" میں "ادائے کافرانہ" اور "تراشِ آذرانہ" دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ ریاض نے اُردو غزل کے روایتی ہدف یعنی ناصح اور محتسب کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ ان کا طنز بہت شائستہ اور لطیف ہے اور اکثر جگہ مزاح کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے۔

احمق پھپھوندوی، جوش ملیح آبادی، چراغ حسن حسرت، عاشق محمد غوری اور پنڈت ہری چند اختر نے طنز و مزاح میں نئے گُل بوٹے کھلائے۔ ان کے پیشِ نظر اصلاحِ تمدن کا مقصد ہے اور وہ فرد کی محرومی، نارسائی، خود فریبی اور جذباتی ناآسودگی کو اپنے طنز و ظرافت کا نشانہ بناتے ہیں اور ایک بہتر ہیئتِ اجتماعی کے خواب دیکھتے ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات میں سیاسی، تاریخی اور سماجی ادراک اور عصری تقاضوں کا احساس موجود ہے۔ دوسری جنگِ عظیم اور تقسیمِ ملک کے باعث بعض نئے مسائل اور نئے رجحانات نے جنم لیا۔ وزیر آغا کے خیال میں یہ دَور ظرافت کے ایک نئے رجحان کا نمائندہ ہے جس میں سماجی طنز زیادہ بھرپور اور جامع محسوس ہوتا ہے۔ اقتصادی مسائل، ہجرت، الاٹمنٹ، سیاسی زندگی کے ہیجان خیز میلانات، عظیم قوتوں کے درمیان سرد جنگ اور ریشہ دوانیوں نے سماجی زندگی کو ایک نئے طوفان سے آشنا کیا۔ چنانچہ اس دور کے شاعروں کے یہاں طنز کا ایک نیا لب ولہجہ اور نئے تیور ملتے ہیں۔ انہوں نے قومی اور بین الاقوامی بے اعتدالیوں کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی وہ چور بازاری، ناانصافی، سیاست کی ہلاکت خیزی اور سماج کے بے تکے اور بے ہنگم عناصر پر طنز کے تیر برسائے ہیں۔ سید محمد جعفری کی نظم "یو۔این۔او"، ضمیر جعفری کی "وبائے الاٹمنٹ" اور مجید لاہوری کی نظم "ماڈرن آدمی" اس کی اچھی مثالیں ہیں خضر تمیمی، حسین میر کاشمیری اور شاد عارفی کے طنز میں گہرائی اور تیکھاپن موجود ہے۔

جدید دَور میں اُردو طنز و مزاح کے بعض اہم رجحانات منظرِ عام پر آئے ہیں۔ پیروڈی کے فن اور تحریف نگاری کی جدت طرازیوں نے ہمارے فکاہی ادب کو بعض نئے زاویوں سے متاثر کیا ہے۔ انگریزی میں انیسویں صدی اور اردو میں بیسویں صدی پیروڈی کے فروغ کا زمانہ ہے اُردو میں اس کی ابتدا کا سہرا بعض ادیبوں کے خیال میں "اودھ پنچ" کے نظم نگاروں کے سر ہے۔ تربھون ناتھ ہجر نے غالب کی غزل جس کا مطلع ہے:

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے   سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

کی اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں پیروڈی لکھی تھی۔ اپنے زمانے کے معاشی مسائل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہجر کہتے ہیں ؎

اک مہینے سے چپکے بیٹھے ہیں   واہ کیا واقعہ نگاری ہے
کیا کریں اب بیچارے اپرینٹس   رات دن شغلِ آہ وزاری ہے
ہائے تخفیف اور ٹیکس کے بیچ   رو چکے سب، ہماری باری ہے

کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ اُردو میں پیروڈی کے فن کے پوری طرح اُبھرنے اور نشوونما پانے کا دَور

میں ان کے مخصوص طرزِ ([illegible]) کی تکرار کھٹکنے لگتی ہے۔ پیروڈی لکھنے والے کو اس شاعر یا ادیب کے تصورات سے اختلاف نہیں ہوتا اور نہ وہ اُن کی معنویت اور عظمت کا منکر ہوتا ہے۔ وہ پیروڈی کے ذریعے سے صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اگر شاعر اپنے طرز اور اپنی مخصوص اصطلاحوں یا اپنے چہیتے الفاظ اور علامتوں میں مقید کر دے تو اس کا اسلوب ایک محدود دائرے میں اسیر ہو کر رہ جائے گا اور اکتا دینے والی یکرنگی اور یکسانیت اس کے کارناموں کی قدر و قیمت کو متاثر کرے گی۔ شوکت تھانوی نے اقبال کے تصورِ مومن اور ان کی مخصوص لفظیات (DICTION) پر پر لطف و مزاح انگیز پیرائے میں اس طرح پیروڈی کہی ہے۔

کمزور مقابل ہو تو فولاد ہے مومن — انگریز مقابل ہو تو اولاد ہے مومن
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — اس قسم کی ہر قید سے آزاد ہے مومن
ہو جنگ کا میدان تو اک طفلِ دبستاں — کالج میں اگر ہو تو پریزاد ہے مومن

موجودہ دور میں مزاح نگاروں نے تحریف اور تضمین کی طرف توجہ کر کے مزاح کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ شوکت تھانوی، واہی، کنہیالال کپور اور مہدی علی خاں کی تحریف کا ایک اور رجحان یہ نظر آتا ہے کہ انہوں نے نامور شعرا کے سنجیدہ اشعار منتخب کئے۔ ان کی ہیئت (FORM) یا ظاہری خدوخال میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور نہ پیروڈی کے تمام لوازم کو ضروری سمجھا بلکہ اصل اشعار میں جو زبان زدِ خاص و عام ہو چکے ہیں محض چند الفاظ کی ردّ و بدل سے مزاح کے رنگ کو چوکھا کر دیا ہے۔

حُسن اُس پری وش کا اور پھر مکاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو میہماں اپنا (راجہ مہدی علی خاں)

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا گداگری
کچھ لیڈری ذریعۂ عزت نہیں مجھے (مجید)

اپنے گھر کی خبر نہ ہو جس کو
وہ مرے دل کا راز کیا جانے (نازش رضوی)

تھا خواب میں پٹھان کو مجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا (راجہ مہدی علی خاں)

کنہیالال کپور نے تحریف کا ایک اور نیا انداز اختیار کیا ہے یعنی ایک ہی شاعر کے کلام سے اس کی مختلف غزلوں کے مختلف مصرعے کسی قسم کی تحریف کے بغیر اس طرح ایک دوسرے سے چسپاں کر دیے جاتے ہیں کہ وہ سنجیدہ مصرعے بالکل جو مزاح کا رنگ پیدا کر دیتا ہے:

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
گر نہیں ہے میرے اشعار میں معنی نہ سہی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
کس کی حالت روا کرے کوئی
موت کا ایک دن معین ہے
اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں
شرم تم کو مگر نہیں آتی

جدید شعرا میں مزاح کی ایک اور تعلیمی اور اصلاحی رجحان ہے جو بچوں میں مزاح سے محظوظ ہونے کی صلاحیت کو ابھارنے اور ظرافت سے دلچسپی پیدا کرنے کے مقصد کی آئینہ دار ہے۔ اس رجحان کے زیر اثر اردو میں بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی گئی ہیں اُن میں مزاح کا معیار وہی ہے جو بچوں کی معصوم فطرت کو متاثر کر سکے لیکن ان نظموں کی تعلیمی اور نفسیاتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان نظموں کا مقصد ناہمواریوں اور کجرویوں کو نمایاں ترین صورت میں شستہ زبان اور سریع الفہم انداز میں ادا کرنا ہے تاکہ بچوں کے ذوقِ مزاح کو تحریک دیکر ان کے ذہنوں کو بلند معیارِ ظرافت کے لئے تیار کیا جا سکے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، حفیظ جالندھری اور راجہ مہدی علی خاں نے اس طرف بطورِ خاص توجہ کی ہے۔

حیدر آباد میں دکنی کے مزاحیہ شاعروں نے اپنے مخصوص انداز میں سماجی زندگی کی کوتاہیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ نذیر دہقانی، سلیمان خطیب، حمایت اللہ اور علی صائب کی شعری تخلیقات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سلیمان خطیب کی شاعری اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اپنی اچھوتی تشبیہوں، پُر اثر امیجری اور سماجی شعور کی مدد سے اپنے کلام کو دلکشی اور معنویت عطا کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اُردو نظم میں طنز و ظرافت کے مختلف رجحانات کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ موجودہ نسل کے شاعروں کی مزاحیہ کاوشیں اس لئے بھی وزن اور وقار کی حامل ہیں کہ وہ اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی سماجی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی کے صدرنگ جلوؤں کا شعور اور نت نئی تبدیلیوں کا احساس رکھتے ہیں۔

■■

خندہ آور" سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اس سے بھی مکمل مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اگر کسی طرزِ نگارش کی خوبی سے متاثر یا مرعوب ہو کر اس کی نقالی کی جائے تو یہ پیروڈی نہیں تتبع ہے۔ پیروڈی کا مقصد دراصل طرزِ نگارش یا طرزِ فکر کے کمزور پہلو کو نمایاں کرنا ہوتا ہے اس لحاظ سے پیروڈی تنقید کی ایک لطیف قسم ہے جو بعض وقت نقاد کی تنقیدوں سے زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہے پیروڈی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کا تعلق کسی ادیب کے اسٹائل یا ظاہری پہلو ہی سے ہو۔ پیروڈی کے ذریعے سے کسی فلسفے یا مخصوص طرزِ فکر کے معنوی نقائص کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے مزاح کی دوسری اصناف سے زیادہ پیروڈی میں گہری نظر اور ذوقِ ظرافت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُن شاعروں پر جو ادب کو سیاست کا تابع محض سمجھتے اور اس کو پروپیگنڈے کا وسیلہ تصوّر کرتے ہیں کنہیا لال کپور نے کس خوش اسلوبی کے ساتھ تنقید کی ہے ع

کبھی قلم ہاتھ میں تھا میرے
غزل بھی کہہ لیتا تھا میں خاصی
نہ جانے کیا میرے جی میں آئی
کہ توڑ ڈالا قلم کو ساتھی
پکڑ کے ہاتھوں میں اک ہتھوڑا
ادب کی تخلیق کر رہا ہوں
ہتھوڑے سے یعنی لکھ رہا ہوں
ادب برائے ماسکو ہے
قسم تجھے ایلیا کی ساتھی
میں شاعری تو نہیں کروں گا
لگاؤں گا اب ادب میں نعرے
کہ آ رہا ہے نیا سویرا

موجودہ دَور کے مزاحیہ شاعروں کے یہاں ایک اور رجحان کام کرتا نظر آتا ہے وہ یہ کہ بعض وقت پیروڈی کو انہوں نے محض تفریحی مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا ہے۔ بعض نقّادوں کا خیال ہے کہ پیروڈی کا بنیادی مقصد تفریح ہے تنقید نہیں۔ یہ تحریفیں سامانِ ظرافت مہیا کرتی ہیں اور قاری کو ایک فرح بخش شگفتگی سے روشناس کراتی ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں، سید محمد جعفری، دلاور فگار اور واہی کے یہاں اس قسم کی پیروڈیاں موجود ہیں۔

عدم آہنگی اور تضاد کا احساس بھی بعض وقت مزاح کی تخلیق کا محرک ثابت ہوتا ہے۔ اسٹیفن لیکاک نے اپنی کتاب "ظرافت اور انسانیت" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مضحک کا اطلاق اُس چیز پر ہوتا ہے جس میں کسی طرح کا بے تکا پن اور عدم تناسب موجود ہو۔ مزاح کے اس پہلو پر زور دینے والے ظرافت نگار یہ تکنیک استعمال کرتے ہیں کہ پُر عظمت اور مہتم بالشان تصوّرات کا غیر اہم، سبک اور ہلکے پھلکے خیالات میں اور پُر شکوہ اور بلند آہنگ الفاظ کا سلیس و سادہ طرزِ ادا میں چربہ اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں چیسٹرٹن، برنارڈ شا، اور جمیس جوائس نے اپنی تخلیقات میں اس طریقے کو برتا ہے۔ انیس اور اور نظیر اکبر آبادی کے مسدّس اپنی شہرت کی وجہ سے جدید دَور کے پیروڈی لکھنے والے شاعروں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ سید محمد جعفری کی ایک نظم "کلرک" ملاحظہ ہو ع

خالق نے جب ازل میں بنایا کلرک کو	لوح و قلم کا جلوہ دکھایا کلرک کو
کرسی پہ پھر اُٹھا یا بٹھایا کلرک کو	افسر کے ساتھ پن سے لگایا کلرک کو

مٹی گدھے کی ڈال دی اُسکی سرشت میں
داخل مشقّتوں کو کیا سر نوشت میں

پروفیسر عاشق نے اقبال کی نظم "ہمدردی" کی تحریف کی۔ میراجی کی نظم "ناگ سبھا کا ناچ"۔ صادق قریشی کی نظم "سلمی"۔ حفیظ جالندھری کے "قومی ترانے" اور اقبال کی نظم "فرمانِ خدا" کی اچھی تحریفیں لکھی گئی ہیں۔ خضر تمیمی اور اخاہ کی کاوشیں بھی اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔

پیروڈی لکھنے والا شاعر اپنے ماڈل یا اصل کی ظاہری ساخت اور اس کے موڈ اور لب و لہجے کی نقل اُتارتا ہے لیکن مواد کے انتخاب میں پورا آزاد ہوتا ہے وہ اپنے ماحول سے مواد حاصل کرتا اور انفرادی و اجتماعی تجربات سے اپنی فکر کے لئے موتی چن لیتا ہے۔ پیروڈی لکھنے کیلئے گہرے مشاہدے، باریک بینی اور دیدہ وری کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ شاعر کا ذہن سرعت کے ساتھ تجربات و واقعات کی کڑیاں جوڑ سکے اور تخصیص میں تعمیم کا جلوہ دیکھ سکے۔ اُردو شاعری میں صنفِ مثنوی کی بھی پیروڈیاں موجود ہیں۔ ضیاء الدین شکیب نے میر کی مثنوی "در ہجوِ خانۂ خود" کی پیروڈی "مثنوی بیچ بیان اپنے ہوسٹل کے" میں کی ہے حسین میر کاشمیری نے بھی اس صنفِ مزاح میں اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔ راجہ مہدی علی خان نے "سحر البیان" کے جواب میں "قہر البیان" اور "زہرِ عشق" کے مقابلے میں "قہرِ عشق" کی پیروڈی پیش کر کے دادِ تحسین حاصل کی۔ انہوں نے "دستکِ نیم شب" میں "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کی بحر اور ہیئت کی تحریف کی ہے "سسرال کی جیل" صنفِ مرثیہ کی تحریف میں اچھی مثال ہے۔

بعض وقت سربرآوردہ شاعروں اور ممتاز ادیبوں کے فنی اکتسابات

سید اکبر حسین رضوی اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء)

انتخابِ اکبر

بہت ہی عمدہ ہے اے ہمنشین برٹش راج — کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو — کہ تیل پیچ میں ہے ڈھیلی اسکی چول بھی ہے
جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبل کی — جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی — کہ آنکھ محو ہے، خاطر اگر ملول بھی ہے
اندھیری رات میں جنگل میں ہے رواں انجن — کہ جس کو دیکھ کے حیران چشمِ غول بھی ہے
شگفتہ پارک ہیں ہر سمت رہروؤں کے لئے — نظر نواز ہے پتی، حسین پھول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر
تو حرج کیا ہے جو ساتھ اسکے ڈیم فول بھی ہے

نامہ کوئی نہ یار کا پیغام بھیجئے — اِس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے
ایسے ضرور ہوں کہ انہیں رکھ کے کھا سکوں — پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجئے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس — سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجئے

ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجئے

یہ بات غلط کہ ملکِ اسلام ہے ہند — یہ جھوٹ کہ ملکِ لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہِ انگلش — یورپ کے لئے بس ایک گودام ہے ہند

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا — کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا — آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

مدخولۂ گورمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا — اسکو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

بدھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں — گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں — حجاب ان کو نہیں آتا، انہیں غصہ نہیں آتا

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ — رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

تھے معزز شخص لیکن انکی لاالف کیا لکھوں — گفتنی درجِ گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے — ایک ہیں خفیہ پولیس میں ایک پھانسی پا گئے

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی — شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

سید مقبول حسین ظریف لکھنوی (۱۸۷۰ء تا ۱۹۳۷ء)

سیاحتِ ظریف (اقتباس)

مقبول جب وطن سے سوئے کربلا چلے — ہمراہ سب عزیز چلے آشنا چلے
کچھ لوگ ساتھ کان میں پڑ ... — خواہش کسی کی یہ تھی کہ ساتھی چلا چلے

پہنچے جو ریل گھر پر بڑا اژدحام تھا
مائل معانقے پہ ہر اک خاص و عام تھا

کچھ ریل گھر کا حال کروں مختصر بیاں — وہ نو بجے کا وقت وہ ہنگامے کا سماں
قلیوں کا لاد لاد کے لانا وہ پیٹیاں — بجنا وہ گھنٹیوں کا، وہ انجن کی سیٹیاں

گڑبڑ مسافروں کی بھی اک یادگار تھی
عورت پہ مرد، مرد پہ عورت سوار تھی

(جہاز پر آمد)

تھیں جن کے ساتھ عورتیں انکا نہ پوچھو حال — لے جانا اور لانا تھا اک جان کا وبال
سیڑھی سے اُن کو لیکے اترنا تھا اک کمال — بے پردگی کا دھیان نہ پردے کا تھا خیال

یہ پردہ داری جان کے اوپر عذاب تھی
ان عورتوں سے مردوں کی مٹی خراب تھی

کہتی تھی کوئی لو میرا برقع اٹک گیا — ہے ہے نیا تھا تین جگہ سے مسک گیا
صاحب سنبھالو سر سے دوپٹہ کھسک گیا — لو پائچہ الجھ گیا، مقنع سرک گیا

کیا گت بنی ہے سب کی نگوڑے جہاز پر
پھسلن ہے کس غضب کی نگوڑے جہاز پر

لو بیوی پاندان کا ڈھکنا بھی گر گیا — آفت پڑے جہاز پہ کتھا بھی گر گیا
توبہ ہے میرے بچے کا ببوا بھی گر گیا — لے لو نگوڑے طوطے کا پنجرا بھی گر گیا

کشتی پہ تیلچی رہ گئی، ہے ہے غضب ہوا
ٹلیا کی ٹوپی بہہ گئی، ہے ہے غضب ہوا

کیا چھوٹی سیڑھیاں ہیں نگوڑی خدا کی مار — ایسا جہاز نوج ہو، در گور، دور پار
ہلتی بھی ہیں نگوڑیاں جنکو نہیں قرار — رسی میں ڈنڈے باندھ دئیے ہیں گئے پانچ چار

زینہ نگوڑ ماروں نے کیسا بنایا ہے
یہ تو موؤں نے نٹ کا تماشا بنایا ہے

کپتان سے کوئی نہیں کہتا کہ کیوں موئے — بھر مٹھی دام تو نے تو ہم سب سے لے لئے
روکا وہاں جہاز کنارے کو چھوڑ کے — آ آ کے جس جگہ پہ ستاتے ہیں رُکھ چڑھے

بیوی کی جھاڑو ایسے موئے بدمعاش پر
اُترے یہاں پہ کوئی کہاں اُسکی لاش پر

شامتِ الیکشن (اقتباسات)

سب سے پہلے اُسکو جس ووٹر کے گھر جانا پڑا — شیخ بدھو نام تھا اور تھا جُلاہا قوم کا
دھوتی باندھے، مرزئی پہنے، تنا بیٹھا ہوا — اک مٹرا مٹی کا حقہ پی رہا تھا کج ادا

جانتے ہی تسلیم کی جب اسکو باصد احترام
منہ کو ٹیڑھا کرکے بولا "کو ہے، بالیکم سلام"

مرزا محمد رفیع سودا (۱۱۹۱ھ تا ۱۱۹۵ھ)

تضحیکِ روزگار (در ہجوِ اسپ) (تلخیص)

ناطاقتی کا اسکی کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اسکے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانندِ نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اسکا جو بازار میں گزار
قصّاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار
جس دن سے اس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ
گزرے ہے اس نمط اسے ہر لیل و ہر نہار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار
تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھاس کا
چوکے کو آنکھ موند کے دیتا ہے وہ پسار
خطِ شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپ کو ٹپکے ہے بار بار
دیکھے ہے جب وہ توبڑا و تھان کی طرف
کھوڑے ہے اپنے سُم سے کنوتیاں مار مار
فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار
ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اسکی تھان کی ہوویں نہ استوار
نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اسکے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار
سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سمند
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار
ہے پیر اسقدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار
لیجاویں چور یا مرے یا ہو کہیں یہ گم
اس تین بات سے کوئی جلدی ہو آشکار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک نہیں دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
ٹک ٹک سے پاشنہ کی مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے توبڑا اسے دکھلائے تھا سئیس
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رو براہ
ہلتا نہ تھا زمین سے مانندِ کوہسار
اس مضحکے کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبّروں میں سے کہتے تھے یوں پکار
پہیے اسے لگا دو کہ تا ہوئے یہ رواں
یا بادبان باندھ پون کے دو اختیار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کنوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار
دستِ دعا اٹھا کے میں پھر وقتِ جنگ کے
کہنے لگا جنابِ الٰہی میں یوں پکار
پہلا ہی گولا چھوٹتے اس گھوڑے کے لگے
ایسا لگے یہ تیر کہ ہووے جگر سے پار
یہ کہہ کے میں خدا سے ہوا مستعدِ جنگ
اتنے میں مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آ دوچار
گھوڑا تھا بس کہ لاغر و سست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اسکے حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفلِ نے سوار
جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں، گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

شیخ ولی محمد نظیر اکبرآبادی (۱۷۳۵ء تا ۱۸۳۰ء / ۱۱۴۸ھ تا ۱۲۴۶ھ)

روٹی نامہ (اقتباس)

جب آدمی کے پیٹ میں جاتی ہیں روٹیاں
پھولے نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں
سینہ اوپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا
کرتا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود جا بجا
دیوار پھاند کے کوئی کوٹھا اچھل گیا
ٹھٹھا ہنسی شراب صنم ساقی اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے
جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہی جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

آدمی نامہ (اقتباس)

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نمازیاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار
اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی جوتیاں دوڑیں بغل میں مار
کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں آدمی کہار
اور اس میں جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کس کس طرح وے بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحبِ عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی دکھاتا ہے اے نظیر
اور سب سے جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

راجہ مہدی علی خاں (۱۹۱۵ء - ۱۹۶۶ء)

مثنوی "قہر البیان" (تلخیص)

یہ کوئی چھ برس پہلے کی ہے بات
مری دُنیا میں آئی اک حسینہ
وہ بولی "ہر مصیبت میں سہونگی"
میں لعنت بھیج دوں گی اپنے گھر پر
مرا گھر کیا تھا ایک چھوٹی سی کُٹیا
نہ تھی کچھ فکر ہم کو مال و زر کی
بکے زیور مزے ہم نے اُڑائے
وہ زیور ہی تھے، کتنے روز چلتے
گئی کُمھلا وہ صورت بھولی بھولی
"یہ بہتر ہے کرو اب کوئی دھندا"
وہ غصّے کی شکن ماتھے پہ لائی
"ترے ساتھ آگئی پھوٹے مرے بھاگ
زباں پر ذکرِ منٹو دن میں دس بار
"نخاف" اک بھی نہیں اور ذکرِ عصمت
تبسّم واجدہ کا کیا کروں گی
کلام میرؔ بھی ہے جوشؔ بھی ہے
اگر فاقوں سے آیا غیظ مجھ کو
ہوئی جب چلنے کی بندی کو خواہش
نہ مجھ ناشاد کی پروا کبھی کی
کبھی آنسو نہ بندی کے سُکھائے
اگر تجھ کو نہ دیتا داد واہی
کیا ہے جعفری نے تجھ کو برباد
مرے وہ اشتراکی احمد عبّاس
کبھی ہوتا ہے یہ محسوس مجھ کو
ندیم قاسمی سو بار آیا
تم آخر کس نشے میں ہوگئے غین
اسے میں آگ کے دریا میں پھینکوں

نہ تھی جب فکر کوئی مجھ کو دن رات
پھنسی جیسے انگوٹھی میں نگینہ
خوشی سے تیری کُٹیا میں رہونگی
چلی آؤں گی میں سب لے کے زیور
یہیں ڈوبی مری قسمت کی لُٹیا
حقیقت سے محبّت بے خبر تھی
وفا کے گیت ہم نے گنگنائے
دیا بجھنے لگا یہ جلتے جلتے
"لگی ہے بھوک" وہ اک روز بولی
کہا میں نے "ہٹو، شاعر ہے بندہ"
معًا دینے لگی وہ یوں دُھائی
وزیر آغا کی نظموں کو لگے آگ
کبھی لاکر نہ دی اک کالی شلوار"
بتادے یہ کہاں کی ہے شرافت
بس اس سے پیٹ کیا اپنا بھرونگی
نہیں ہے گھر میں آٹا ہوش بھی ہے
سُنایا فیض احمد فیض مجھ کو
کہا "پڑھ لو ذرا احسان دانش"
جو کی تو فکرِ شادؔ امرتسری کی
بڑے صوفی تبسّم بن کے آئے
نہ آتی میرے گھر پر یہ تباہی
جو آکر دے گیا جھوٹی تجھے داد
وہ کر دے گا ترا بھی ستیاناس
بھگا لے جائے گا وہ روس تجھ کو
کبھی اس نے بہن مجھ کو بنایا!
سدا ذکرِ کتاب "قرۃ العین"
ستی ہوتے ہوئے میں اس کو دیکھوں

نہ آئے یاں کنہیا لال "مردہ"
جو ہنس ہنس پگڑیاں سب کی اُچھالے
نہ سمجھو شاذؔ کو میں چھوڑ دوں گی
مجھے اس تونسوی کی فکر بھی ہے
عدم مُلکِ عدم جاتا نہیں کیوں
میں تنگ آئی تری بد عہدیوں سے
ادب نے گو مجھے لُٹی کرائی
کنوئیں میں کرشن چندر کو میں پھینکوں
زباں سے لفظ بیدی گر نکالا
بتا مجھ کو ترا ساحر کہاں ہے
جلا دے پھاڑ دے دیوانِ فانیؔ
نہیں یہ شاہد احمد مجھ کو بھاتا
جو ہوتی کچھ شرافت اس میں باقی
اِدھر آ تجھ کو سیدھی رہ پہ ڈالوں
بس اب دونوں نے رکھدی طاق پر شرم
بڑی منہ زور رہا تھا پائیاں تھیں
اِدھر پائل بجی چھم چھم چھما چھم
کبھی جو گال تھے ہنسے گلابی
چُھٹیں اس لب سے پھلجھڑیاں وہ پیاری
دُعا یہ ہے اُٹھے ہیں مجھ پہ جو ہاتھ
دعا یہ ہے مری لے ذاتِ باری
دعا یہ ہے مرے اے میرے مالک
دعا یہ ہے کرے منہ اِس کا کالا
اسے یوسف ظفر رستے میں پیٹے
اثر صہبائی بھی آجائے جھٹ سے
بتِ گلفام را دشنام گفتنی
اسے پھینکے برائے نیک نامی
پکڑ لیں جوشؔ و عرشؔ ملسیانی
وہ آئیں بن کے ڈاکو منہ لپیٹے
بلا سے گروہ "ویجی ٹیرین" ہیں
دعا ہے اب اسے جلد موت آئے
وہ بھاگی جھٹ سے اب کُٹیا کے باہر
لگی کہنے کہ "بس اب تجھ پہ لعنت
یہ سُن لے میں تجھے ٹُھکرا رہی ہوں

"کپور آباد" کا مشہور "گردہ"
ذرا اب اپنی ٹوپی بھی سنبھالے
میں اس کی تمکنت بھی توڑ دوں گی
لبوں پر تیرے اس کا ذکر بھی ہے
یہ اب حیلے سے باز آتا نہیں کیوں
یہ آئے دن کی "باقر مہدیوں" سے
کرے گا کیا قتیل احمد شفائی!
ہے ڈوبا یا نہیں اُوپر سے دیکھوں
بجا دوں گی میں فوراً تیرے بارہ
کہاں وہ دشمنِ شاہ جہاں ہے
"مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی"
جو "سیّد" ہو موئی ٹھمری ہے گاتا
رسالے کا نہ رکھتا نام "ساقی"
خلیل الاعظمی تیری نکالوں"
ہوئے ہم دونوں آہن کی طرح گرم
بڑی خونریز جنگ آرائیاں تھیں
اِدھر ٹکّے چلے دھم دھم دھما دھم
ہوئے اب تھپیڑوں سے وہ عنابی
کہ سکتہ ہوگیا شاعر پہ طاری
ہتوڑے سے انہیں توڑے جگن ناتھ
چبا ڈالے اِسے فارغ بخاری
اِسے لے جائے علم الدین سالک
وہی "شہ نامۂ اسلام" والا
اسے عابد علی عابد گھسیٹے
لگائے ایک مکّہ اس کو کھٹ سے
یہ کہہ کر بیٹھ دے ممتاز مفتی
قطب مینار سے خوشتر گرامی
کریں بندی پہ اتنی مہربانی
اسے کھا جائیں دونوں باپ بیٹے
حقیقت ہے کہ دونوں ایرین ہیں
اسے پطرس بخاری آکے لے جائے"
نگاہِ قہر ڈالی اک پلٹ کر
گئی چولھے میں تیری سب محبّت
میں "دولت خاں" کے گھر اب جا رہی ہوں"

بولے یہ پہلے نہ آیا ہیں، ہوا اتنا قصور   شیخ بدھو آپ مجھ پر رحم فرمائیں حضور
آپ کو والد کہا کرتے تھے بھائی اب سے دور   میں بھتیجا آپ کا ہوں، ووٹ لے لونگا ضرور

بولے بدھو کا کہیو ہم کہکا کہکا بوٹ دے ائی
بوٹ پہئے اُو جو نُرتے ہم کا دس کا لوٹ دے لی

آگے بڑھ کے ایک حضرت کا ہوا پھر سامنا   اُن سے جا کر اس طرح کی عرض با صد التجا
بندہ پرور ایک مذہب ہے ہمارا آپ کا   ووٹ دیجیے گا جو مجھ کو آپ خوش ہوگا خدا

ہیں مرے حلقے میں جو جو میرے مذہب کے خلاف
دیکھیے ممبر ذرا ہولوں تو کر دوں سب کو صاف

مہتر اُن کے در پہ جھاڑو دینے آئے کیا مجال   اور سقا مشک سے نالی دُھلائے کیا مجال
ٹکس گھر والے کا ان پر بندھ نہ جائے کیا مجال   لے لیں بمبا گھر میں بے میٹر لگائے کیا مجال

ناچ نگنی کا انہیں اب میں نچاؤں گا حضور
دیکھیے کس کس طرح ان کو ستاؤں گا حضور

خوش ہوئے سُن کر جناب مولوی مکتبی   ہاتھ پھیر ا ریش پر اور اس طرح تقریر کی
آپ اسکے اہل ہیں میری نظر میں واقعی   ذاتِ سامی کو سمجھتا ہوں میں فخرِ ممبری

مخزم میں وعدہ قبل از وقت کر سکتا نہیں
فرض ہے ایفائے وعدہ پھر مُکر سکتا نہیں

رائے دیدوں گا عوض میں آپکو "خمسین" کے   اتنے ہی ملتے ہیں مجھ کو وعظ کے تلقین کے
حضرتِ والا تو کچھ پابند ہیں آئین کے   اس سے کم رہنا مرادف ہے مری توہین کے

ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ تقلیل فرما دیجیے
ہے یہ کارِ خیر اب تعجیل فرما دیجیے

پھر بڑھے آگے یہاں سے ووٹ کے ارمان میں   گھس پڑے یہ ایک مُنز قصاب کی دوکان میں
نثر میں پڑھ کر قصیدہ پہلے اسکی شان میں   چاہتے تھے یہ کہیں کچھ شیخ جی کے کان میں

یوں کنوتی کو بدل کر شیخ صاحب نے کہا
سنئے حجرت، ہم کی لیٹی نہیں رکھتے جرا

چودھری نے کل کہا تھا ہم سے اے بھیا سکور   سیکھ مُنّے جس کو کہدیں ووٹ دیدینا جرور
پر منا ہی کر گئے جب مولبی عبد الکفور   ا بھجی کو ووٹ دے سکتے نہیں ہم تو مجبور

سُنتے ہیں کُرآن میں پھر مائے تھے کُھد رسول
دین کی جب بات ٹھہری ڈھل دینا ہے پھجول

پیر لوٹن شاہ تھے اک خاندانی تکیہ دار   آنکھ میں سرمہ کئی رتی، گلے میں چند ہار
ریشِ اقدس پان کے دھبوں سے رشکِ لالہ زار   گیروا کرتا گلے میں، ہاتھ میں اک پشتِ خار

زرد تہمد، پاؤں میں لکڑی کی اونچی سی کھڑاؤں
گھومتے پھرتے تھے یونہی شہر شہر اور گاؤں گاؤں

پہنچے ورکر انکی خدمت میں بہ تعجیلِ تمام   دو روپے نذرانے کے دیکر کیا جھک کر سلام
عرض کی ہیں آپ تو حاجت روائے خاص و عام   شیخ جی کا ووٹ دلوا دیجیے بس ہے یہ کام

چونکہ حضرت کی ہیں بیعت میں میاں عبد الشکور
آپ فرما دیں اگر تو ووٹ دیدیں گے ضرور

آپ کی دعوت کا کل گھر پر کرونگا انتظام   شیخ جی کو بھی بلا لونگا وہیں پر وقتِ شام
تذکرہ میں ووٹ کا چھیڑوں گا مابینِ طعام   آپ انکو حکم دیدیں گے تو ہو جائے گا کام

بولے لوٹن شاہ، بابا خوش رہو، دعوت قبول
ہم فقیروں کی دعا سے ہوگا سب مطلب حصول

شعر آشوب (اقتباسات)

منعقد دیہات میں ہوتی ہے جب بزمِ سخن   اور بلائے جاتے ہیں اطراف سے کچھ اہلِ فن
جب سواری سے اُترتے ہیں اسیرانِ محن   ان کا استقبال یوں کرتے ہیں اہلِ انجمن

پہلے قربانی کے بکرے کی طرح گردن میں ہار
انکے پڑتے ہیں جو ہوں شعر و سخن کے جاں نثار

بعض اس مجمع میں سنجیدہ ہیں، بعضے بانگڑو   دیکھ کر اُن سب کو کرتے ہیں یہ باہم گفتگو
کا ہے ہو بھیا بساون تم کو بتلائیں کو تو   جن کی نٹی مال پڑے ہیں ہار سب شاعر ہیں تو

کا طبلیا اور سرنگیا لوگ اُن کے ساتھ ہیں؟
پھر کس گئی ہیں گجل یو سب تو کھالی ہاتھ ہیں؟

اک کٹر پا سُن کے یوں کرنے لگا اظہارِ رائے   یہ تو شاعر تھا پھسڈی اور بڑھیا کوئی آئے
جو گجل میں جلف کا، ماسوک کی انکسا دکھائے   ہم سے سو کھینوں کے دل پر کچھو وا اپنا دکھائے

ڈانٹ کے للکار کے ہر ایک مے پھل میں پڑھے
جو گجل ہو کے یہ کہہ ڈالے، مکابل میں بڑھے

بھائیوں نو کار شاعر ایمیں ہو جائے گریج   راگ میں اور راگنی میں چاہیے اسکو تمیج
جو کہیتی اور پہیتی جانتا ہو دونوں چیج   آج کل ہے پھل میں ہوتا ہے وہی ہر دل اجیج

آسک و ماسوک کی کھود بھی ادا دکھلائے جو
چوٹ دل پر دے کے سب مے پھل کو لیک گرمائے جو

بھائی مولا بجس جس بستی میں ہم آباد ہیں   اس جگہ ساعر بڑے بڑھیا ہیں، مادر جاد ہیں
ان سبھوں میں سیکھ بدلو[1] اک جگت استاد ہیں   اُن کو ہر مو کے کی گجلیں مُنہ جُبانی یاد ہیں

جس جگہ استاد نے دو تین گجلیں جھاڑ دیں
ساعروں نے ہو کے سرمندہ بیاجیں پھاڑ دیں

یہ نمائس میں ابھی دیوے گئے تھے پار سال   ایک حکّانی گجل ایسی سُنائی بے مثال
حاکم اور تے سیلدار ایسے ہوئے سُن کے نہال   دیدیا تمگا انہیں سونے کا جھٹ لے کیل و کال

اور جو ساعر نمائس میں گئے پھس ہو گئے
بس جگت استاد بدلو گول مڈلس ہو گئے

[1] ایک سال چودھری اعزاز رسول سندیلوی نے ہردوئی شریف کی نمائش کے مشاعرے میں آرزو لکھنوی کو سونے کا ایک تمغہ دیا۔ اس محفل میں ظریف کے بڑے بھائی صفی لکھنوی بھی موجود تھے۔ چنانچہ ظریف نے اپنے انداز میں اس واقعہ پر تبصرہ کیا ہے۔
(ادارہ)

فرقت کاکوروی (۱۹۱۰ء - ۱۹۷۳ء)

فیملی پلاننگ

بچّوں کا شور ہم - ہم سب کا زور -
کان میں ماں باپ دے لیں انگلیاں - بھول جائیں پی کہاں -
اور گھبرا کر کہیں - یہ کیا ہوا ؟
دیش کی زینت بڑھی - شہرت بڑھی -
جو کیا، اچّھا کیا - جو کچھ ہوا - اچّھا ہوا -
چاندنی بچّوں کی ہو - اور چاند ہو بچّہ بدوش -
تاکہ ہر شئے دیش کی - آئے نظر بچّہ فروش -
ہر دم یہی اک فکر ہو - اولاد ہی کا ذکر ہو -
ہر سمت چاہے کال ہو - سارا جہاں پامال ہو -
بدحال ہو - بے حال ہو - کنگال ہو -
بچّوں سے مالا مال ہو!
گھر میں اگر کھانا نہیں - پانی نہیں - دانا نہیں -
چاہے کوئی ناشاد ہو -
گھر میں اگر چلمن نہیں اِک شمع تک روشن نہیں -
آٹا نہیں - راشن نہیں -
ایک دن سفر کو ہم چلے - اور ریل میں ہم گھُس گئے -
بچّوں سے ہم منہ موڑ کر - سارے کلنڈر چھوڑ کر -
اور گھیر لیں سیٹیں تمام - رکّھا مگر یہ اہتمام -
سارے مسافر ہوں کھڑے - ہر سمت ہوں بچّے پڑے -
اک شور و ہنگامہ رہے - گردش میں پیمانہ رہے -
کوئی جیئے چاہے مرے - اپنا سفر اچّھا کٹے -
بچّوں کی پیدائش میں ہم - جیبیں ہیں کی آلائش میں ہم -
وقفے کبھی دیتے نہیں - دنیا سے ہم ہیٹے نہیں -
لڑکی ملے، لڑکا ملے - لُولا ملے، لنگڑا ملے -
پوتی ملے، پوتا ملے - سیدھا ملے، ٹیڑھا ملے -
جب جانکی کا گھر بسا - اور بارھواں بچّہ ہوا -
بولے یہ سُن کر جانکی - سب دَین ہے بھگوان کی -
بابا نے پوچھا کیا ہوا ؟ بولے کہ پھر لڑکا ہوا!
بولے چلو اچّھا ہوا - اولاد کا کوٹا بڑھا
بولے کہ یہ کیا کھائے گا؟ - اس کے لئے کیا آئے گا ؟
کیونکر یہ پالا جائے گا ؟
اس کا ابھی سے ذکر کیا - اس کی ابھی سے فکر کیا ؟
ہم سب فقیروں کو یہاں اتنی بھلا فرصت کہاں ؟
اولاد بھی پیدا کریں - اور بیٹھ کر سوچا کریں ؟
پیسے کہاں سے آئیں گے ؟ کپڑے کہاں سے لائیں گے ؟
ہاں گر حکومت یہ کہے - بچّے نہ اب پیدا کرو -
کوئی نیا دھندا کرو -
فوراً وزارت توڑ دو - ہم کو ہمیں پر چھوڑ دو -
بچّوں کی رکھوالی کرو - ہم سب کی نقّالی کرو -
یہ کام ہے اولاد کا - ماں باپ کا -
یہ اپنا اپنا کار ہے - آزادیٔ اظہار ہے -
سرکار پر کیا بار ہے - ہر فرد ذمّے دار ہے - اولاد کا - افتاد کا -
غلّہ نہ ہو - پیسہ نہ ہو - کپڑا نہ ہو - لتّا نہ ہو -
وہ جن کا بہتر حال ہے - ان کا بھی یہ احوال ہے -
جب سائیکل پر چل دیئے - کُل فیملی اپنی لئے -
دو ٹوکری میں ہیں نہاں - دو کا ہے ڈنڈے پر مکاں -
شانوں کو دو پکڑے ہوئے - گردن میں دو جکڑے ہوئے -
ہے کیریر پر ماں لدی - لڑکی ہے گھنٹی سے بندھی -
سائیکل نے فرّاٹے بھرے - لڑکوں نے خرّاٹے بھرے -
پھر زن زنا زن زن زنن - زن زن زنا زن زن زنن

پنڈت ہری چند اختر (۱۹۰۱ء - ۱۹۵۸ء)

(مولانا ظفر علی خاں کی نذر جن کی ایک نظم کے کچھ الفاظ آگے پیچھے ہو گئے تھے)

پھر ظفر کے بعد گائے ایسے ڈھولے کون گا
پھر سُنائے ٹھمریاں، ٹپّے جو بولے کون گا؟

اُمّتِ مرحوم کی جیبیں ٹٹولے کون گا
بھر کے لے جائے یوں ہی چندے کے جھولے کون گا!

نبض تک خاموش پڑ جاتی ہے رعبِ حسن سے
حالِ دل پوچھا اگر اُس نے تو بولے کون گا؟

ہے شبِ وعدہ اِدھر مجھ پر ہے غلبہ نیند کا
وہ اگر آئے تو پھر دروازہ کھولے کون گا؟

مولانا ظفر علی خاں ظفرؔ (۱۸۷۰ء تا ۱۹۵۶ء)

جب آئیں سائمن اس طرح استقبال ہو جائے
کہ پہنچے جس جگہ نازل وہیں ہڑتال ہو جائے

ہمارا یہ وطن آزاد ہو چٹکی بجاتے میں
ہر اک ہندو اگر پنڈت جواہر لال ہو جائے

سنبھالیں چرچ برکن ہیڈ اور انکے ہمنوا طائر
ذرا اگر عندلیب اسلام کی چونچال ہو جائے

خلافت کانگریس اور لیگ کا ایکا یہ کہتا ہے
کہ الٹی آسمانِ پیر کی ہر چال ہو جائے

اگر ہندوستاں کو نعمت آزادی کی حاصل ہو
تو لکھن توس کا برطانیہ میں کال ہو جائے

میری طرح سڑی نہیں، لٹھ وہ پولیس کے کھائے کیوں
بیٹھ کے دو لسرے کے ساتھ شیخ پے نہ جائے کیوں؟

قیدِ فرنگ و بندِ زیست دونوں سے بے نیاز ہیں
موت سے پہلے آدمی جیل سے باہر آئے کیوں؟

ٹوڈیوں کی ہر اک دلیل جب کہ ہے خس سے بھی ذلیل
بیٹھ کے گول میز پر دینے لگے وہ رائے کیوں؟

علتِ مفلسی میں جب ووٹ بھی ہم نہ دے سکے
جیل میں بھیج کر یہ ناچ آپ نے پھر نچائے کیوں؟

آئے دن اپنوں میں ہوتی جو نہ دانتا کل کل
ہونے پاتے نہ وہ اس طرح پرایوں کے دبیل

ریزولیوشن کہاں تک پاس کرتے ہم چلے جائیں
یہ چکّی کانگریس بیٹھی ہوئی کس وقت تک پیسے

ایبسٹریکٹ آرٹ

ایبسٹریکٹ آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے
کی تھی از راہِ مروّت بھی ستائش میں نے

آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں

ایک تصویر کو دیکھا جو کمالِ فن تھی
بھینس کے جسم پر اک اونٹ کی سی گردن تھی

ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں
ٹانگیں کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں

نقشِ محبوب مصوّر نے سجا رکھا تھا
مجھ سے پوچھو تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا

بولی تصویر جو میں نے اُسے اُلٹا پلٹا
میں وہ جامہ ہوں کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا

ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے
ورقِ صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے

اس کو کمیونزم کا آزار کہا کرتے ہیں
اس کے خالق جو ہیں بیمار رہا کرتے ہیں

ایک تصویر جو دیکھی تو یہ صورت نکلی
جس کو سمجھا تھا انناس وہ عورت نکلی

ایبسٹریکٹ آرٹ کی اس چیز پہ دیکھی لے ساس
تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس

اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے تھے
ڈر کے ماؤں کے کلیجوں سے لپٹ جاتے تھے

سید محمد جعفری

کلرک

خالق نے جب ازل میں بنایا کلرک کو
لوح و قلم کا جلوہ دکھایا کلرک کو

کرسی پہ پھر اُٹھایا بٹھایا کلرک کو
افسر کے ساتھ پن سے لگایا کلرک کو

مٹی گدھے کی ڈال کے اسکی سرشت میں
داخل مشقتوں کو کیا سرنوشت میں

چپراسی خلد میں جو بلا لے گیا اُسے
حوروں نے کچھ مذاق کیا کچھ ملک ہنسے

حیران تھے کلرک، کہ کیسے بُرے پھنسے
ہاتف نے دی صدا کہ یہ کچھ دن ہیں یا بسے

آدم کا "رف ڈرافٹ" ہے کب تک ہنسو گے تم؟
"اپرووڈ" ہو کے آیا تو سجدہ کرو گے تم

جنّت کو گرچہ ناز تھا اپنے مکین پر
تھا ان کی زندگی کا سہارا "روٹین" پر

"ٹی اے" وصول کرنے کو اُترا زمین پر
لفظِ "کلرک" لکھا تھا لوحِ جبین پر

ابلیس راستے میں ملا، کچھ پڑھا دیا
اُترا فلک سے "تھرڈ"، میں "انٹر" لکھا دیا

عید کی نماز

عیدِ اضحیٰ کی نماز اور وہ انبوہِ کثیر
جب کہ اللہ کے دربار میں تھے پاک وزیر

وہ مصلّوں پہ مسلّط تھے بحسنِ تقدیر
تھے "ریزرو" کے ان کے مصلّے یہ مساوا اکثیر

آج کل یہ ہے نماز اور کبھی وہ تھی نماز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

صفِ اول میں کھڑے تھے جو خدایانِ مجاز
یہ امیر اور یہ غریب اور یہ نشیب اور یہ فراز

تجھ سے اے خالقِ کُل چھپ نہیں سکتا ہے یہ راز
تو حقیقی، وہ مجازی، مجھے دونوں سے نیاز

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
کبھی رکھتے ہی نہیں اور کبھی رکھتے ہیں

عطر میں ریشمی رومال بسایا ہم نے
ساتھ لائے تھے مصلّٰی وہ بچھایا ہم نے

دُور سے چہرہ وزیروں کو دکھایا ہم نے
ہر بڑے شخص کو سینے سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
کون کہتا ہے کہ ہم لائقِ دربار نہیں

رضا نقوی واہی

پیدائش ۱۹۱۴ء کھوا ضلع چھپرا (بہار)۔
پانچ کتابوں "اشارہ" حصہ اول، "اشارہ" حصہ دوم "نقشِ جمیل"، "فکرِ جمیل" اور "واہیات" کے مصنف ہیں۔ "اردو شاعری اور بہار" ہندی میں شائع ہو چکی ہے۔
ملک کے مقبول ترین مزاحیہ شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔

مُلّا کا پروگرام

مُلّا کو اگر آپ کبھی ڈھونڈنا چاہیں
وہ پچھلے پہر نفخ کی حالت میں ملے گا

اور صبح کو وہ بندۂ مجبورِ مراسم
سُکڑا ہوا محرابِ عبادت میں ملے گا

بعد اسکے وہ ہوٹل میں خدا دین میاں کے
ناسازیٔ معدہ کی شکایت میں ملے گا

اور دن کو چھڑی ہاتھ میں لیکر سرِ مکتب
مصروف وہ توسیعِ جہالت میں ملے گا

اور شام کو جنّات کی مسجد میں کنویں پر
تسخیرِ اجنّہ کی ریاضت میں ملے گا

اور محفلِ میلاد ہو یا بزمِ عروسی
ہر رات وہ بریانی کی دعوت میں ملے گا

لال فیتہ

لال فیتہ ہے وہ معشوقِ ستم گر واہیؔ
فیض سے جسکے ہے آفس میں نوابی دربار

کتنے احکام ہوئے اسکے خم و پیچ میں قید
کتنی اسکیمیں ہوئی اسکے تغافل پہ نثار

لال فیتے کا ہوا بند کفن جس کو نصیب
اُسکی قسمت میں ہے آفس کی درازوں کا مزار

کسی درخواست کا جبتک کہ نہ ہوئے چہلم
فاتحہ خواں نہیں ہوتا قلمِ خوش رفتار

حکمِ پنشن کا دفاتر سے ہے چلتا اُس وقت
جب پہنچ جاتے ہیں تا ملکِ عدم پنشن خوار

ناشاد دہلوی

(پیدائش ۵ر اگست ۱۹۰۹ء بمقام پشاور۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں

اور تقسیمِ ملک کے بعد دہلی میں سکونت پذیر ہیں)

غزل

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
جنّت کی آرزو ہے تو دُنیا بھی چھوڑ دے

اخباروں کے مدیروں سے جو دوستی نہیں
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

احباب کو جو قرض دیا ہے وہ بھول جا
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

بے شک میاں کے ساتھ رہے بیوی رات دن
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

دلاور فگار

نام دلاور حسین فگار تخلّص۔ ۸ر جولائی ۱۹۲۸ء کو بدایوں (اتر پردیش) میں پیدا ہوتے۔ ۱۹۴۲ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈاک خانے میں ملازم ہوگئے۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے بی اے کیا اور پھر معاشیات میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اُن کے والد مقامی اسلامیہ ہائی اسکول میں مدرس تھے۔ لہٰذا جب ۱۹۵۰ء میں اُن کا انتقال ہوا اُسی ادارے میں اُستاد کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہو گیا۔

۱۹۵۴ء میں اُن کی غزلوں کا ایک مختصر مجموعہ "حادثے" شائع ہوا۔ اُن کے مزاحیہ کلام کا پہلا مجموعہ "ستم ظریفیاں" ۱۹۶۳ء میں، دوسرا مجموعہ "شامتِ اعمال" ۱۹۶۴ء میں اور تیسرا "آداب عرض" ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔

شکوہ

(پانچ مہینے تک کالج میں تنخواہ نہ ملنے پر)

کیوں گنہگار بنوں فرض فراموش رہوں
کیوں نہ تنخواہ طلب کر کے سبکدوش رہوں

طعنے بنیوں کے سُنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں کوئی بدھو ہوں کہ خاموش رہوں

جراٴت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ تنخواہ کا، خاکم بہ دہن، ہے مجھ کو

یوں تو مدت سے ہے کالج میں تری ذات قدیم
شرطِ انصاف ہے اے والدِ اولادِ یتیم

ہم نے بویا ہے ترے کھیت میں تخمِ تعلیم
ہم نے پیدا کئے ہر دور میں بقراط حکیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ کھانے کو تو مسجد میں بھی آسانی تھی

ہم تو جیتے ہیں فقط علم کی خدمت کیلئے
اور مرتے ہیں تو تہذیب کی عظمت کیلئے

ٹیوشنیں کرتے ہیں کچھ وہ بھی ضرورت کیلئے
ورنہ کیا اور ذرائع نہیں دولت کیلئے؟

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
تیری سروس کے عوض پیری مریدی کرتی

تو ہی کہدے کہ کیا پوسٹ رجسٹر کس نے؟
امتحانوں میں بنا کر دیئے پیپر کس نے؟

دیئے شاگردوں کو انصاف سے نمبر کس نے؟
معرکۂ انوجی لیشن کا کیا سر کس نے

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار تو ہیں، مرنے کو تیار نہیں

آگیا عین پڑھائی میں اگر پیٹ کا خیال
ماسٹر بھول گیا ماضی و مستقبل و حال

رہ گیا بورڈ پہ لکھا ہوا آدھا ہی سوال
آگئے یاد گرامر کے عوض اہل و عیال

گیٹے و شیلی و خیام و وَلی ایک ہوئے
بھوک دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہ شکایت نہیں، ہیں اُنکے خزانے معمور
نہیں تختی پہ جنہیں نام بھی لکھنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کلّو کو ملیں حور و قصور
اور ہم بی ٹی، ڈی سی ٹی کو فقط وعدۂ حور

رحمتیں عام ہیں ہر کہتر و مہتر کے لئے
ڈیڑھ سو دن کا مہینہ ہے تو ٹیچر کے لئے

واقف مراد آبادی
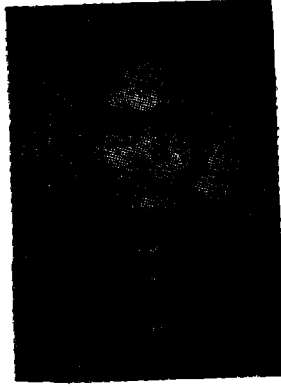
حضرت واقف مراد آبادی مرحوم
۹ جمادی الاول، ۱۳۱۱ھ سنبھل ضلع مراد آباد
میں پیدا ہوئے نام سید یعقوب الحسن نقوی،
تخلص واقف وطن سنبھل و امروہہ ضلع مراد آباد۔ بمبئی کے
فساد میں ان کی فلم "قافلہ" جو تقریباً تیار تھی نذرِ آتش ہوگئی۔ پھر دہلی آگئے اور پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج میں متواتر آٹھ سال تک فارسی اردو پڑھاتے رہے ۱۹۶۲ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (ادارہ تعلیم ہند) نے ایک اعزازی وثیقہ سے نوازا جو سات ہزار روپے سالانہ تھا۔ ۱۹۶۶ء تک جاری رہا۔ تصانیف: (۱) "نغماتِ ابد" رباعیات و قطعات سرمد کا اُردو ترجمہ مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس اردو بازار دہلی (۲) "رباعیاتِ عمر خیامؔ" کا ترجمہ اردو میں، مطبوعہ مشورہ بکڈپو، رام نگر دہلی (۳) "رباعیاتِ عمر خیام" کا ترجمہ ہندی میں۔ (۴) "آئینۂ سنگ" طنزیات واقف زیرِ طبع (۵) "بزمِ فردوس" ایک تمثیلی جنتی مشاعرہ حضرت بہادر شاہ ظفر مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس اردو بازار دہلی۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۹ء کو ان کا انتقال ہوگیا اپنے پیچھے ایک بیوہ چار لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑا ہے۔ عابدہ حجاب (اہلیہ واقف مرحوم)

نظم

ایک شب فکرِ سخن میں رات جب ڈھلنے لگی
طبعِ موزوں شاہراہِ شعر پر چلنے لگی

اِک صدائے نرم و نازک سنتے ہی میں کھو گیا
اوئی۔ اب تک جاگتے ہو یہ تمہیں کیا ہو گیا

تندرستی کر دی غارت شاعری کے پھیر میں
بے خبر مرغے اذاں دینے کو ہیں کچھ دیر میں

دل دھڑکتا ہے تمہاری زار حالت دیکھ کر
ہَول اٹھتے ہیں مجھے تو شانِ وحشت دیکھ کر

سر ہلانا، گنگنانا، کچھ اشارے۔ کچھ ہنسی
سر پکڑ کر بیٹھنا یوں، جان آفت میں پھنسی

چھت کو تکنا اور کسی دیوار و در سے بات چیت
بڑبڑانا۔ کھانسنا کھوئے سے، دیوانوں کی ریت

گویا حاوی کر لیا ہے روح پر شیطان کو
نوج یہ آزار لگ جائے کسی انسان کو

پان والوں کی دُکاں پر سنئے انکی بولیاں
چائے خانوں میں ملینگی شاعروں کی ٹولیاں

ختنہ، مونڈن ہو کہ شادی۔ یا کوئی تہوار ہو
چائے کی پیالی پہ ہی تم رقص پر تیار ہو

تال سُر لازم ہے۔ گو ڈھولک نہیں تالی نہیں
شاعری بیکار ہے گر شانِ قوالی نہیں

شاعری میں تم پنپ جاؤ کہیں ہے یہ مجال
اسمیں کچھ ترکیبیں بھی لازم ہیں، ہے میرا خیال

پیر حجی، ملحد، شرابی۔ یا سڑی کچھ بھی سہی
پھالو کھا پن ہو شاعر میں کسی نے ہے کہی

آلۂ تفریح دنیا نے بنایا ہے تمہیں
سادہ دل احمق زمانے بھر میں پایا ہے تمہیں

دیکھ لینا ایک دن اِس شاعری کا فیضِ عام
کام شاعر کا پکارد۔ پھیری کر کے صبح و شام

ہے سہالک کا یہ موسم اور ضرورت آجکل
قسط پر ہی کہلوا لو۔ مرثیہ، سہرہ، غزل

ٹوٹے مصرعوں کی مرمت، شعر جڑوانے کا کام
مطلع مقطع اور رباعی قطعہ بالکل سستے دام

ڈھیلی چولیں شعر کی کسوا لو جو کس کام ہے
نظم پر رندا کرا لو۔ گر کوئی اِسقام ہے

سچ تو یہ فن کی ادب کی بات تم نے کھوئی ہے
ایسے درجے سے گرے اوقات تم نے کھوئی ہے

ماچس لکھنوی

حضرت ماچس لکھنوی کا اسمِ گرامی مرزا محمد اقبال تھا۔ ماچس لکھنوی کے نام مشہور تھے۔ ۱۹۱۸ء میں اپنے آبائی مکان متصل کاظمین گیٹ میں پیدا ہوئے اور ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء کو مختصر علالت کے بعد بعارضۂ کینسر وفات پائی۔

غزل

شیخ آئے جو محشر میں تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

تحقیق کیا اُن کا جو شجرہ تو یہ پایا
کچھ یونہی سی ننھیال ہے ددھیال ندارد

تعداد میں ہیں عورتیں مردوں سے زیادہ
قوّالیاں موجود ہیں قوّال ندارد

ہے اُس بتِ کافر کا شباب اپنا بڑھاپا
ماضی ہے اُدھر گول اِدھر حال ندارد

ماں باپ بہن بھائی سب اُلجھے ہیں مرے ساتھ
اب گھر مرا سسرال ہے سسرال ندارد

محشر میں گھس آیا ہے گرہ کٹ کوئی شاید
یارب ہے مرا نامۂ اعمال ندارد

اللہ رے ستم وصل کا جس سال تھا وعدہ
وہ ہو گئے دنیا سے اُسی سال ندارد

ماچسؔ نہ کہیں نالۂ سوزاں سے لگے آگ
ہو جائے نہ پنڈال کا پنڈال ندارد

سگار لکھنوی

(نام فرخ نواب، تخلص سگار لکھنوی ہے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۳۱ء کو اپنے آبائی مکان واقع محلہ کاظمین میں پیدا ہوا۔ میرے والد جناب مرزا محمد عزیز معزز لکھنوی ہیں اور حقیقی چچا مشہور طنز و مزاح نگار حضرت ماچس لکھنوی مرحوم۔ انٹرمیڈیٹ میں فیل ہوگیا تو ترک تعلیم کے بعد کانپور کے بجلی گھر میں بطور اپرنٹس ملازمت کرلی۔ اب ٹاٹا پاور کمپنی بمبئی میں خاصی معقول تنخواہ پر ملازم ہوں۔ انیسؔ، آرزوؔ، جوشؔ، اکبرؔ ماچسؔ، سید محمد جعفری کے کلام سے متاثر ہوں۔ سگار)

قطعات

نہ اس زمیں سے نہ اُس آسماں سے ڈرتا ہوں
نہ ہی میں رستم و چنگیز خاں سے ڈرتا ہوں
کسی سے ڈرتا ہوں بس اپنی زندگی میں اگر
تو ایک اُن سے اور اک اُنکی ہل سے ڈرتا ہوں

جب بھی دیکھا ہمیں دوڑا دیئے کُتے ہم پر
پڑ گئے پیچھے شریفوں کے یہ اچھا ہے مذاق
آپ کے باپ نے کُتوں کا سہارا لیکر
"ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق"

دَل بدلیوں کا شوق یوں چمٹا ہے جان سے
اِس وقت تک اسی پہ ہیں سب مائلِ عمل
نکلے ورودھی دَل سے الیکشن جو ہار کے
نیتاؤں نے بنالیا فوراً "نرودھی دَل"

ہلال رضوی

قطعات

"پاکیزہ"

دے گئی دنیا کو غم دنیا نے غم جس کو دیا — راہیٔ ملکِ بقا مینا کماری ہوگئی
جب تلک مینا رہی دنیا کو اس سے پیار تھا — جونہی پاکیزہ بنی اللہ کو پیاری ہوگئی

"گھر کا چراغ"

وہ کھیلنے کے واسطے جاتا تھا باغ کو — اک مہ جبیں کے ساتھ میں آتا تھا باغ سے
بیوی سے جا کے کہہ دیا بچے نے ماجرا — اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

جدید شاعری

میں تھا جدید شاعری کرنے کے موڈ میں — ذہنِ رسا سے رات تخیل اڑا رہا
مفہوم کے بغیر ہی کہنے لگا میں شعر — مفہوم شعر ایک طرف کو پڑا رہا
آیا میری زباں پہ نہ فعلن مفاعلن — چھوٹا رہا کوئی، کوئی مصرعہ بڑا رہا
تھا اُس ادھیڑ بن میں کہ کچھ آئیں شاعرات — جن کا قدیم رنگ میں جھنڈا گڑا رہا
میں نے کہا کہ کچھ کہو رنگِ جدید میں — سُن کر یہ اُن کا روئے سخن فق پڑا رہا
پر پھڑ پھڑا کے رہ گئیں بیچاری شاعرات — پائے خیال اپنی جگہ پر اَڑا رہا
بزمِ جدید میں نہ گئیں شب کی مرغیاں — سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا

آفتاب لکھنوی

پیدائش الہ آباد ۱۹۱۹ء تعلیم ایم اے۔ سکونت ۱۹۲۰ء کے بعد سے برابر لکھنؤ میں رہی۔ شاعری کا ذوق یونیورسٹی کے زمانے سے ہے۔ طنزیہ مزاحیہ قطعات، نظمیں، غزلیں وغیرہ قریب تیس سال سے برابر کہتے آرہے ہیں۔ مجموعۂ کلام "چھلانگ" اُردو اور دیوناگری رسم الخط میں زیرِ طباعت ہے۔

غزل

یہ فردیاں ہیں ستاروں کو ضوفشاں نہ کہو — یہ اُن کے سر کا دوپٹہ ہے آسماں نہ کہو
لحاظِ نسبتِ اسم و عمل مقدم ہے — جو فاختہ نہ اڑائے خلیل خاں نہ کہو
یہ میکدہ ہے نکالو رقم۔ پیو۔ کھسکو — کہاں سے آئے ہو کیا حال ہے یہاں نہ کہو
ہوا ہے تم پہ فلو کا یہ تیسرا حملہ — کفن منگاؤ حکیموں سے داستاں نہ کہو

مرا خلوص ہے محدود چائے پانی تک
یہ مختصر سا گڑھا ہے اسے کنواں نہ کہو

سرور ڈنڈا (رنگ دکن)

ڈنڈا مرحوم کا نام غلام سرور خاں تھا اور ڈنڈا تخلص۔ سرور ڈنڈا کے نام سے شہرت حاصل کی۔ حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ کالج آف فائن آرٹس سے پینٹنگ کا ڈپلوما حاصل کیا لیکن آخری وقت تک تعمیرات کی ٹھیکہ داری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ دیہاتی زبان میں شعر کہتے تھے۔ حیدرآباد کی شعر و سخن کی محفل اُن کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی تھی۔ کلام کچھ ایسے دلکش انداز میں سناتے تھے کہ محفل جھوم جاتی تھی۔ ان کا کلام پڑھے لکھے اور اَن پڑھ طبقے میں یکساں طور پر مقبول تھا۔ مگر افسوس کہ اب تک ان کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔

غزل

ان کی وہ اوندھی چال ہے سو ہے — جینا اپنا محال ہے سو ہے
گاڑی اپنی اُلال ہے سو ہے — دل کوں اپنے ملال ہے سو ہے
ہوکو برباد اُن کے ہاتھاں سے — اب بھی اُن کا (دکو) خیال ہے سو ہے
تھپڑ ایسا اُنوں رسید کریں — اب تلک سرخ گال ہے سو ہے
اُن کی قسمت میں مرغی اور مچھّی (وہ) — میری قسمت میں دال ہے سو ہے
جب بھی چاہیں گے رنگ بدلیں گے — یتّا ہم میں کمال ہے سو ہے (اِتنا)
ایسے روشن زمانے میں ڈنڈا — ایّو الفت کا کال ہے سو ہے (افسوس)

سلیمان خطیب

سلیمان خطیب دکنی زبان کے مشہور مزاح نگار ہیں وہ قصبہ چٹگوپہ ضلع بیدر (کرناٹک) میں ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ضلع میدک اور حیدرآباد میں تعلیم پائی۔ کلکتہ میں واٹرورکس کی ٹریننگ حاصل کی اس وقت فلٹر بیڈس گلبرگہ کے سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق ہے بہت سارے لوک گیت جمع کئے اور ان ہی لوک گیتوں کی چاشنی نے انہیں دکنی زبان کا شاعر بنا دیا۔ پروفیسر مبارز الدین رفعت نے کچھ نظمیں اور مضامین "سلیمان خطیب اور ان کا کلام" مرتب کرکے بنگلور سٹیزن لائبریری سے شائع کیا۔ دوسرا مجموعۂ کلام "کیوڑے کا بن" "ادارۂ زندہ دلانِ حیدرآباد" ترتیب دے رہا ہے۔

ایک کلرک کی موت (۲۸ تاریخ کو)

روز لٹ لٹ کو جان کھا کھا کو (دھکّے کھا کر)
مُنڈی کاٹی کو پہلے مرنا تھا
ایسا مرنا بھی کیا کا مرناجی
کہتے لوگاں کے پاواں پڑپڑ کو (کہتے ہیں) (لوگوں) (پاؤں)
جینا مرنا تمہارا قرضے کا
اِتّا احسان ہم پو کرنا تھا (اتنا)

اچھا جنگل میں سوگئے آکو (آکر)
لے کو مٹھی میں جان بیٹھی ہے (لے کر)
گھر میں بیٹی جوان بیٹھی ہے
گھر سے میّت کو میں اٹھائی ہوں
آج پھولاں اُدھار لائی ہوں (پھول)
تنخا لینے کے بعد مرنا تھا (تنخواہ)

مرزا شکور بیگ

مرزا شکور بیگ حیدرآباد کے قدیم محلے فتح دروازہ میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے بی اے ایل ایل بی کیا۔ چند دن شہر حیدرآباد میں وکالت کرنے کے بعد ضلع ورنگل میں سکونت اختیار کی۔ آندھرا پردیش اسمبلی کے بھی رکن رہے۔ زندگی کی اب تک ۶۵ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔

غزل

(۱)

ممکن نہ ہو تو آنے کا وعدہ نہ کیجئے
ہم ٹاپتے رہیں کہیں ایسا نہ کیجئے

کچھ دیر سُن کے خونِ تمنا کی داستاں
یہ مشورہ دیا کہ تمنا نہ کیجئے

دینی ہو جو سزا وہ دیا کیجئے مگر
پبلک کے سامنے ہمیں رسوا نہ کیجئے

ہم مر گئے تو آپ پہ آخر مرے گا کون
کہتے ہیں اس لئے ہمیں کوسا نہ کیجئے

بیزار ہو کے یار نے مرزاؔ سے یہ کہا
یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا نہ کیجئے

(۲)

اُنہیں در پیش جب کوئی بہت دشوار کام آیا
بلاوے کا ہمارے نام لاسلکی پیام آیا

سفارش اور رشوت چل رہی ہے بزمِ ساقی میں
ترستے رہ گئے مخلص نہ اُن تک دورِ جام آیا

ملی فرصت نہ اپنے عقد کی بیچارے قاضی کو
مگر یہ کام کیا کم ہے کہ وہ اوروں کے کام آیا

پڑی ہے آجکل عاشق کی صحت اُلٹے چکر میں
گیا نزلہ ہوئی کھانسی گئی کھانسی زکام آیا

وکالت کر کے گم نامی کی حالت میں رہے مرزاؔ
بلیڈر سے بنے لیڈر تو اخباروں میں نام آیا

عبداللہ ناصر

عبداللہ ناصر ۱۵ جولائی ۱۹۰۲ء کو بمبئی شہر میں ایک معزز انصاری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ امام الدین اُن کے والد کا نام تھا۔ ناصر صاحب کی تعلیم و تربیت شہر بمبئی میں ہوئی اور پھر بمبئی میونسپل کارپوریشن کے اُردو اسکول میں مدرس ہو گئے۔ اور ریٹائرڈ ہونے تک درس و تدریس میں لگے رہے بحیثیت ہیڈ ماسٹر۔ ریٹائر ہونے کے بعد بمبئی کے مشہور و موقر روزنامہ "انقلاب" میں ایک مخصوص طنزیہ کالم "تازیانے" شروع کیا جو کافی پسند کیا جاتا رہا۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔

غزل

نگاہِ نازِ جاناں بم نہیں ہے
تنبہ کاری میں لیکن کم نہیں ہے

بجز تیرے نہیں اس میں کوئی اور
دلِ عاشق ہے یہ البم نہیں ہے

غلط سمجھو نہ میری ہم نشیں کو
وہ ہے سکریٹری بیگم نہیں ہے

مرے مرنے کا فوٹو لینے آئے
کرم ان کا یہی کچھ کم نہیں ہے

کریں گے آہ سگریٹ کے سہارے
کہ اب آہوں میں اپنی دم نہیں ہے

بڑھاپے کو خدا رکھے سلامت
سوا اس کے کوئی ہمدم نہیں ہے

برق آشیانوی

بیزار زندگی سے اگر کوئی شخص ہے
اس کو نہ زہر دیجیے، نہ شاعر بنائیے

تعلیم یافتہ کسی خاتوں کے ہاتھ کے
کھانے پکے ہوئے اُسے دو دن کھلائیے

اک نو بیاہی لڑکی نے پوچھا طبیب سے
منصوبہ بندی کا کوئی نسخہ بتائیے

بولا طبیب شربتِ لیمو پیا کریں
شرما کے پوچھا لڑکی نے... پہلے... یا... بعد میں

کہنے لگا طبیب یہ آسان حل یہی
پہلے نہ بعد، بلکہ ہے "نعم البدل" یہی

شب کو بس اسٹانڈ پر اک نوجواں نے یہ کہا
"صبح دم آیا تھا میں شب کا اندھیرا ہو گیا"

ایک مردِ پیر نے یہ سن کے فرمایا "میاں
میں جوانی میں یہاں آیا تھا بوڑھا ہو گیا"

اک نوجوان بیٹھ کے روتا تھا زار زار
کل سہ پہر کو سامنے اک اسپتال کے

میں نے زراہِ خلق و مروت اُسے کہا
"کیوں بیٹے -؟ بات کیا ہے؟ کیا والد گذر گئے؟"

غصے میں آکے بولا "وہ مرتے تو غم نہ تھا
غم تو مجھے یہ ہے کہ وہ صحت یاب ہو گئے"

عورت جو آج شانہ بہ شانہ ہے مرد کے
ہاتھوں میں اسکے آئی حکومت کی بھی لگام

پورا نہیں ہوا ابھی انصاف اسکے ساتھ
عورت نہیں ہے پوپ، پجاری، یا پیش امام

بوگس حیدرآبادی

میرا پورا نام سید نصیر الدین احمد ہے۔ تخلص سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں بالکل اپنے ماں باپ سید عزیز الدین احمد و اختر بیگم کے مشترکہ تعاون سے ۱۰ اکتوبر انیس سو چالیس عیسوی میں پیدا ہوا۔ انیس سو چونسٹھ میں والدِ محترم کی سفارش سے محکمۂ تعلیمات سے وابستہ کر دیا گیا اور آج تک بھی میرا پیشہ تدریس ہے۔ میں نے مزاحیہ شاعری انیس سو ساٹھ سے شروع کی۔ میری پہلی اور آخری شادی ۲۶ جنوری انیس سو اکہتر میں ہوئی۔ اب تک تین لڑکے معرضِ وجود میں آ چکے ہیں۔

غزل

حُسن والوں کو گھورتا کیا ہے
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

خالہ ماں سے کرینگی امّی بات
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

مطمئن ہیں اگر غریب عوام
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ایک زردار حُور کا ہے سوال
اور درویش کی صدا کیا ہے

ایسے کمسن بتوں سے دل نہ لگا
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

کھا کے جُوٹھن وہ خود سمجھ لیں گے
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

کوئی بیوہ ہی مجھ سے بوگس کو
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

حمایت اللہ

۴۲ سال قبل حیدرآباد کے ایک فوجی گھرانے میں پیدا ہوا۔ والد کیپٹن غلام مرتضیٰ صاحب مرحوم نے میرا نام محمد حمایت اللہ رکھا —— پی ڈبلو ڈی اور دیگر سرکاری محکموں میں ٹھیکہ داری کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہوں، فائن آرٹس اکیڈمی اور "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے بانیوں میں سے ایک ہوں۔

مجتبیٰ حسین صاحب کے حیدرآباد سے دہلی منتقل ہو جانے کے بعد "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے معتمد عمومی کا عہدہ مجھ پر لاد اگیا۔
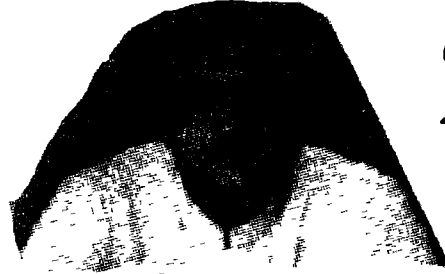
چوآ (قطعہ)

الٰہی یہ لیڈر سمجھ پا گئے کیا　　شرافت کے رستے انہیں بھا گئے کیا
جدھر دیکھئے حق میں اردو کے لیکچر　　الیکشن کے دن پھر قریب آ گئے کیا

کانٹوں پر زباں رکھدی

(سیماب اکبرآبادی کی روح سے معذرت کے ساتھ)

"یہ کس نے شاخِ گل لا کر قریب آشیاں رکھدی
کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھدی"

سمجھ میں صاف نئیں[1] آیا تو پوچھا شاخِ گل کیا ہے؟
یہ گل بوسی بولے تو کیا، قریبِ آشیاں کیا ہے؟
تو بولے شاخِ گل بولے تو پھولوں کی ڈنگالی[2] ہے
یہ گل بوسی بولے تو پیار پھولوں سے ٹِگالی[3] ہے
قریبِ آشیاں کا بھی اُنو[4] مطلب بتا ڈالے
زبردستی جو منہ بند تھا سو وہ منہ کو کھُلا ڈالے
ارے کیا شاعری ہے دیکھ رئیں واہ واہ رے واہ رے واہ
اِدھر لوگاں[5] بھی واہ واہ بول رئیں واہ واہ رے واہ رے واہ
مگر اک بات رہ رہ کر مرے دل میں کھٹک رئی ہے
سنا ہوں جب سے یہ شعراں میری عقل بھٹک رئی ہے
جدھر مُنگس[6] ہے واں پہ سانپ رہنا بھوت[7] مشکل ہے
چمن نئیں سو جگہ بلبل کا رہنا بھوت مشکل ہے
جدھر گل ہے اِدھر بلبل بھی رہتے ان کے گھر رہتے
جدھر بھی چاندنی رہتی چکوراں[8] بھی اُدھر رہتے
چمن نئیں سو جگہ پو گھر بنایا کون ہُولا[9] تھا
وہ بلبل تھا یا کوا تھا وہ بجو تھا یا کولا تھا
چلو پت جھڑ کا موسم ہو ئینگا یہ مان لیتوں میں
خزاں ہوگی چمن برباد ہوگا مان لیتوں میں
خزاں میں پھر یہ شاخِ گل کدھر سے کون لایا ہے
یہ اُپلیوں کو ڈُبا کو پھترے پانی پو ترا یا رے
سنا ہوں قیس کو ہر چیز میں لیلیٰ نظر آئی
نظر والا اُنے[10] نے جاں بھی اُسے لیلیٰ نظر آئی
تو ہو گا وہ بھی شاخِ گل کا دیوانہ زمانے سے
جبھی کو شاخِ گل سکی[11] ڈنگالی پو نظر آئی
نہ کانوں سے کوئی دیکھا نہ آنکھوں سے کوئی سنتا
یہ گل بوسی میں بوسہ ہے تو بوسہ ہونٹ سے ہوتا
اِنے تو شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پو زباں رکھ رائے
کیا اُسکے ہونٹ پھٹ گئے تھے جو کانٹوں پو زباں رکھ رائے
زباں سے چاٹتیں[12] چکتیں[13] مزہ اور منہ چڑاتے ہیں
حکم دبتیں[14] زباں سے اور اسی سے گڑگڑاتے ہیں
زباں کا لفظ رکھنا ہے تو رکھ لو اپنا کیا جاتا
رکھے تو یوں رکھو وہ شعر کو مطلب بھی صاف آتا
"یہ کس نے شاخِ گل لا کر قریب آشیاں رکھدی
کہ میں نے شوقِ "گل چاٹی[15]" میں کانٹوں پر زباں رکھدی

[1] نہیں [2] ڈالی [3] لاڈ پیار [4] انہوں نے [5] لوگ [6] نیولا [7] بہت [8] چکور [9] بے وقوف

[10] وہ [11] سوکھی [12] چاٹتے ہیں [13] چکھتے ہیں [14] دیتے ہیں [15] گل چاٹنا

مصطفیٰ علی بیگ

۱۹۵۸ء میں بی۔ ایس سی کیا۔ "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے بانیان میں سے ایک ہیں مزاحیہ شاعر اور خاکہ نگار کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

"اینگلو اردو" کے شاعر ہیں۔ ریڈیو کے اکثر پروگراموں میں حصہ لیا کرتے ہیں۔

قطعہ (اینگلو اردو)

ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار　　اتنا بتا دے میرے یار
سارے ستارے اُنکی قسمت　　اپنا ستارہ کیوں دُم دار

غزل (اینگلو اردو)

وہ بے وفا تھے راہ کی ٹرننگ میں رہ گئے　　ہم تو اکیلے لائف کی برننگ میں رہ گئے
خالہ تو ٹائٹ گرل ہیں خوشیوں میں عید کی　　افسوس اب کے خالو ہی ہینڈ نگ میں رہ گئے
یاں کام نکلا کرتے ہیں سب بیک ڈور سے　　دیوانے مین ڈور کی واچنگ میں رہ گئے
شادی کے بعد وہ کئی بچوں کی ہیں مدر　　غافل تھے ہم جو عشق کی لرننگ میں رہ گئے
سب کی ٹرینِ عشق تو منزل پہنچ گئی　　ہم انتظارِ یار کی شنٹنگ میں رہ گئے

وہی خدمت انجام دے رہا ہے جو اَب سے ستر برس قبل "اودھ پنچ" نے انجام دی تھی۔ یعنی اس نے مزاح نویسوں کی ایک پوری نئی نسل کو جنم دیا ہے جس کی سب سے درخشاں مثال مجتبیٰ حسین ہیں۔ ہند میں یوسف ناظم حیدرآبادی اور پاکستان میں مشتاق احمد یوسفی کو ہم رشید اور پطرس کی درمیانی کڑی کہہ سکتے ہیں (یہ امر غور طلب ہے کہ دراصل مشتاق احمد یوسفی بھی ہندوستان کی پاکستان کو دین ہیں) یوسف ناظم اور مشتاق احمد یوسفی دونوں ایک عرصے سے لکھتے آئے ہیں لیکن دونوں میں خصوصاً موخرالذکر میں لکھ کر چھپانے کی جگہ لکھ کر چھپانے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ "فٹ نوٹ" یوسف ناظم کے کلاسیکی طرزِ نگارش کی اعلیٰ مثالیں پیش کرتا ہے۔

اگر پاکستان میں مشتاق احمد یوسفی نے پطرس کی جگہ لے لی ہے اور اعلیٰ ترین طنز و مزاح کی روایت کو جاری رکھا ہے تو یہ دیکھ کر حوصلہ بڑھتا ہے کہ ہند میں بھی اس پائے کا جوہر مجتبیٰ حسین میں موجود ہے۔ مجتبیٰ حسین ابھی نوجوان ہیں، وہ اپنی طبّاعی، ذہانت، ظرافت اور خلّاقانہ اُپج کے زور پر طنز و مزاح کے میدان میں ایک فاتح کی طرح داخل ہوئے اور میدان پر میدان سر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ فرقت کاکوروی نے ان کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا "اگر یہ کچھ پہلے پیدا ہو گئے ہوتے تو ہم ایسوں کو کون گھاس ڈالتا؟" ہماری دعا ہے کہ وہ اپنی فطری ظرافت کو مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی مدد سے اور جِلا دے سکیں اور رشید احمد صدیقی کی طرح ایک فلسفہ حیات اور نظامِ اقدار بھی پیدا کر سکیں۔ انکے مضامین کے چار مجموعے "کیف و کم"، "قطع کلام"، "قصہ مختصر" اور "تکلف برطرف" اب تک شائع ہو چکے ہیں اور وہ نہ صرف اردو بلکہ ہندی دنیا میں بھی بڑی تیزی سے مقبول ہو چکے ہیں۔

"زندہ دلانِ حیدرآباد" میں چند اور قابلِ ذکر ہستیاں رشید قریشی (مزاجِ شریف) مرزا حمایت علی بیگ "نگارشاتِ حمایت" (جس میں منٹو پر مضمون کا مطالعہ ادب کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے) برق آشیانوی ("یہ ایک تبسم") اور مسیح انجم ("سائیڈ سے چلیئے") ہیں۔ اس انجمن کا ایک اور کارنامہ "شگوفہ" ہے جو ملک کا پہلا قابلِ ذکر مزاحیہ ماہنامہ ہے۔

حیدرآباد ہی کے اظہر افسر نے مزاحیہ ڈراموں میں خصوصی امتیاز حاصل کیا ہے۔ انکے مزاحیہ ڈراموں کا دوسرا مجموعہ "موج در موج" حال ہی شائع ہوا ہے۔

لکھنؤ اسکول کی حالیہ مزاحیہ کتابوں میں نواب حیدر علی خاں حشم کی "معجونِ نشاط" قابلِ ذکر ہے۔ ہماری موجودہ مزاحیہ شاعری کا بیشتر حصہ پیروڈی یا تحریف نگاری پر مشتمل ہے۔ یوں تو ہر مزاحیہ شاعر غالب و اقبال کو تختۂ مشق بنانے سے باز نہیں آتا لیکن حشم صاحب نے یہ غضب کیا ہے کہ انہوں نے تمام قدما کی فہرست بنا کر ایک ایک کی خبر لی ہے۔

مجموعی طور پر ہمیں یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ آج جبکہ مزاحیہ نثر کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے۔ مزاحیہ نظم کے اُفق پر ابھی تک ایک دُھند چھایا ہوا ہے۔

کتابیات

رشید احمد صدیقی "طنزیات و مضحکات" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ - ۱۹۷۳ء صفحات ۲۴۰۔ قیمت ۹ روپے۔ رشید احمد صدیقی "ہمارے ذاکر صاحب" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۱۰۰۲۵ ۱۹۷۳ء صفحات ۱۹۱۔ قیمت ۸ روپے۔

خواجہ عبدالغفور "شگوفہ زار" شہر یار عابدی شکیل احمد ۱۹۷۰ء صفحات ۳۱۶۔ قیمت ۱۰ روپے۔

خواجہ عبدالغفور "لالہ زار" محمد قربان لاری والا۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت ۵ روپے۔

(معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کتاب بیچنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ ملنے کا پتہ مکمل درج نہیں ہے)

غلام محمد عمر خاں (مرتب) "ذکرِ یار"۔ ادبی ٹرسٹ بک ڈپو حیدرآباد۔ ۱۹۷۱ء صفحات ۳۸۴۔ قیمت ۵ روپے۔ ملنے کے پتے۔ ادبی ٹرسٹ اور غلام محمد خاں۔ قادر باغ۔ بیرین جیدرآباد ۸۔

بھارت چند کھنہ "تیرِ نیم کش"۔ زندہ دلانِ حیبدرآباد۔ ۲ مجرد گاہ معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد۔ ۱۹۷۲ء صفحات ۳۰۰۔ قیمت ۵ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ ادبی ٹرسٹ بک ڈپو، حیدرآباد۔ ۱

نریندر لوتھر "مزاج پرسی"، زندہ دلانِ حیدرآباد۔ ۲ مجرد گاہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد۔ ۱ ۱۹۷۳ء صفحات ۱۲۰۔ قیمت ۵۰ر۳ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ ادبی ٹرسٹ بک ڈپو۔ کنارا بنک۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد۔ ۱

یوسف ناظم "فٹ نوٹ"۔ نصرت پبلشرس۔ چوک لکھنؤ۔ ۳۔ ۱۹۶۹ء۔ صفحات ۱۶۰۔ قیمت ۵۰ر۳ روپے۔

مجتبیٰ حسین "قطع کلام"۔ نیشنل بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدرآباد۔ ۱۹۷۰ء صفحات ۱۵۲۔ قیمت ۵۰ر۳ روپے۔ ملنے کے پتے۔ نیشنل بک ڈپو اور ادبی بک ٹرسٹ۔ کنارا بینک بلڈنگ۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد۔ ۱

مجتبیٰ حسین "قصہ مختصر"۔ نیشنل بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدرآباد۔ ۲۔ ۱۹۷۲ء۔ صفحات ۱۶۰۔ قیمت ۵ روپے۔

رشید قریشی "مزاجِ شریف"۔ زندہ دلانِ حیدرآباد۔ ۲۷ مجرد گاہ۔ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱۔ ۱۹۷۳ء۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت ۵ر۳ روپے۔

کرنل مرزا حمایت علی بیگ "نگارشاتِ حمایت"۔ وِلا اکیڈمی عزیز باغ۔ سلطان پورہ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴۔ ۱۹۷۳ء صفحات ۱۱۵۔ قیمت ۳ روپے۔ ملنے کے پتے۔ وِلا اکیڈمی اور کرنل مرزا حمایت علی بیگ صاحب محبوب منزل۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴۔

مسیح انجم "سائیڈ سے چلیئے"۔ مینار بک ڈپو۔ چارکمان، حیدرآباد ۲۔ ۱۹۷۲ء۔ صفحات ۱۴۲۔ قیمت ۵۰ر۲ روپے۔

اظہر افسر "موج در موج"۔ نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنو۔ ۱۹۷۳ء۔ صفحات ۱۷۰۔ قیمت ۴ روپے۔

شہباز حسین ۵۰۴ نیمار پور، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۶

چند نئی مزاحیہ کتابیں

(یہ جائزہ کم و بیش انہی کتابوں پر مشتمل ہے جو "آج کل" میں تبصرہ کے لئے موصول ہوئی ہیں۔ تفصیلات مضمون کے خاتمہ پر درج ہیں)

ہند میں اردو مزاح نویسی کے چند خصوصی مراکز رہے ہیں۔ آزادی کے قبل یہ مراکز دلّی، لکھنؤ، علی گڑھ اور لاہور تھے۔ آزادی کے بعد یہ مراکز محض حیدرآباد اور کسی حد تک لکھنؤ رہ گئے ہیں۔

ابھی تک طنز و مزاح کے فن اور تکنیک پر رشید احمد صدیقی کی "طنزیات و مضحکات" واحد کتاب ہے۔ گو اس کے بعد پاکستان میں وزیر آغا اور ہندوستان میں غلام احمد فرقت نے بھی طنز و مزاح کی تاریخ و تنقید کے سلسلے میں اس فن پر روشنی ڈالی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مکتبۂ جامعہ نے حال ہی میں رشید صاحب کی "طنزیات و مضحکات" کا ایک نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

اس کے علاوہ خواجہ عبدالغفور نے بھی لطائف و ظرائف کے دو مجموعے "قہقہہ زار" و "شگوفہ زار" شائع کر کے اردو پڑھنے والوں پر احسان کیا ہے کیونکہ انہوں نے موخر الذکر کتاب میں نہایت ہی سادہ اور دل نشیں الفاظ میں طنز و مزاح کی مختلف اقسام پر بھی روشنی ڈالی ہے اور مثالوں کے ساتھ اپنے مفاہیم کو واضح کیا ہے۔ خواجہ صاحب نے ابھی حال میں اپنے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ "لالہ زار" کے نام سے پیش کیا ہے۔

مکتبۂ جامعہ نے رشید صاحب کی ایک نئی کتاب "ہمارے ذاکر صاحب" بھی شائع کی ہے جس میں اُن کے چار مضامین ذاکر صاحب کے بارے میں ہیں۔ ان میں سے تین یعنی "مرشد" "ذاکر صاحب" اور "موجِ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال" ذاکر صاحب کی حیات میں لکھے گئے تھے اور چوتھا "ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے" اُن کی وفات کے بعد۔ رشید احمد صدیقی ہمارے عظیم ترین مزاح نگار ہیں اور "ہمارے ذاکر صاحب" میں ان کا فن اپنے معراج پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں خندہ و گریہ و سنجیدگی کے درمیان ایک نہایت باریک اور شفاف پردہ حائل ہے جس کے باعث قاری کو ہمیشہ ایک مکمّل تصویر نظر آتی رہتی ہے اور ذاکر صاحب کی ایک جیتی جاگتی بھرپور اور دل میں اتر جانے والی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ آخری مضمون میں کچھ رثائی اور واعظانہ رنگ زیادہ ہو گیا ہے لیکن یہ بھی فطری ہے کیونکہ رشید صاحب اُردو کے وہ منفرد مزاح نگار ہیں جن کا مزاح ایک فلسفۂ حیات اور ایک نظامِ اقدار کے ساتھ وابستہ ہے۔ فلسفۂ حیات کسی حد تک غالب اور نظیر اکبر آبادی اور نظام اقدار بڑی حد تک اکبر اور کرشن چندر کے یہاں بھی موجود ہے لیکن ان دونوں کا مجموعہ صرف رشید صاحب کے یہاں پایا جاتا ہے جو ہنسی ہنسی میں بڑے کام کی بات کہہ جاتے ہیں۔ رہے دوسرے مزاح نگار تو ان کے یہاں صرف اچھوتا پن اور طرزِ ادا کا ہیر پھیر ہے۔

سیرت نگاری کی ایک اور مثال "ذکرِ یار" سے نمایاں ہوتی ہے۔ یہ مجموعہ ہے سعادت علی خاں کے خطوط اور مضامین کا جو ان کی وفات کے بعد انکے دوستوں نے چند ناشناسی مضامین کے اضافے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ سعادت علی خاں، نواب زین یار جنگ کے صاحبزادے تھے۔ انکی والدہ رقیہ بیگم بنتِ سید علی بلگرامی تھیں۔

سعادت علی خاں ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے، پنڈت نہرو کے پارلیمنٹری سکریٹری بنے پھر عراق و ترکی میں ہند کے سفیر رہے۔ چھٹی پر دلّی واپس آئے اور یہیں اچانک کوئی پچاس برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کے خطوط سے ایک ایسی شخصیت نمایاں ہوتی ہے جس کی شگفتہ مزاجی، خوش دلی اور بذلہ سنجی غالب کی طرح وسعتِ قلب اور انسان دوستی پر مبنی تھی۔ طرزِ تحریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

> "کیا کہا شیخ ہم اپنے خطوں پر تاریخ نہیں لکھتے، کیوں لکھیں؛ عمر گھٹتی جا رہی ہے۔ قرس بڑھتا جا رہا ہے۔ وقت کی امواج سرگرمِ خرام ہیں اور وقت بنی انسان کا ازلی دشمن ہے ... اے فقیر و درویش وقت کے پیچھے کیوں دوڑتا ہے، تمہاری طبیعت کبھی بے حال اور کبھی بحال رہتی ہے۔ یہ سب وقت ہی کی کرامات ہے۔"

جس وقت سعادت علی خاں اپنے دلچسپ خطوط لکھ رہے تھے اسی وقت حیدرآباد میں بھارت چند کھنّہ اور نریندر لُوتھر نے اپنی فکاہیات شروع کیں۔ بھارت چند کھنّہ چونکہ "اسپورٹس مین" ہیں اور مزاح کا "اسپورٹس مین شپ" کے ساتھ گہرا تعلق ہے جو اپنی شکست کو خندہ پیشانی اور اپنی فتح کو انکسار کے ساتھ قبول کرنے کا گُر سکھاتی ہے، لہٰذا وہ فطرتاً مزاح نگار ہیں جس کا ثبوت انکے مجموعے "تیرِ نیم کش" کے ہر مضمون سے ملتا ہے۔ بقولِ کرشن چندر "ان کا لب و لہجہ تازہ اور شگفتہ، اندازِ تحریر اچھوتا اور شاداب، چوٹ گہری اور کاری ہوتی ہے۔" نریندر لُوتھر افسانہ نگاری کی راہ سے مزاح نگاری تک پہنچے ہیں۔ اُن کی فکاہیات کا مجموعہ بھی "مزاح پرسی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، لیکن ان کا وہ معرکہ آرا مضمون جس نے ان کو واقعی ایک اعلیٰ پائے کے مزاح نگار کے طور پر منوایا ہے یعنی "حیدرآباد کا تغرافیہ" اس مجموعے میں شامل نہیں۔ کھنّہ اور لُوتھر دونوں آئی اے ایس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دونوں پنجابی الاصل ہیں، لہٰذا ان "زندہ دلانِ پنجاب" نے "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے قیام میں ہر ممکن مدد دی۔ بلکہ کھنّہ تو اس کے قیام سے آج تک اس ادارے کے صدر ہیں۔

ادارۂ "زندہ دلانِ حیدرآباد" اُردو طنز و مزاح کے احیاء و فروغ میں

ہند و عراق کے خوشگوار تعلقات

ہز ایکسی لنسی مسٹر صادم حسین ، نائب صدر، جمہوریہ عراق نے اپنے حالیہ دورۂ ہند میں ۲۶ مارچ ۱۹۷۴ء کو راشٹرپتی شری وی وی گری سے ملاقات کی۔ عراق نے ہند کو کثیر مقدار میں خام تیل دینا منظور کر لیا ہے۔

ملک کے بہترین گرام سیوک اور گرام سیویکا

۲۸ مارچ ۱۹۷۴ء کو مرکزی وزیر زراعت شری فخرالدین علی احمد نے ۱۹۷۲-۷۳ء کے بہترین گرام سیوک اور گرام سیویکا کو خصوصی انعامات عطا کیے۔ تصویر میں بہترین گرام سیوک، ہنگل بلاک، ضلع دھاروار کرناٹک شری ہلا تپا نور ناتھ اور بہترین گرام سیویکا، نور محل بلاک ضلع جالندھر، پنجاب کی شریمتی اجیت کور، وزیر زراعت سے بات چیت کر رہے ہیں۔

Vol 32 No. 10 AJKAL (MONTHLY) May 1974
Published by the Director, Publications Division, Patiala House NEW DELHI-11001
Printed by Indian Printing works, Rani Jhansi road, NEW DELHI-55
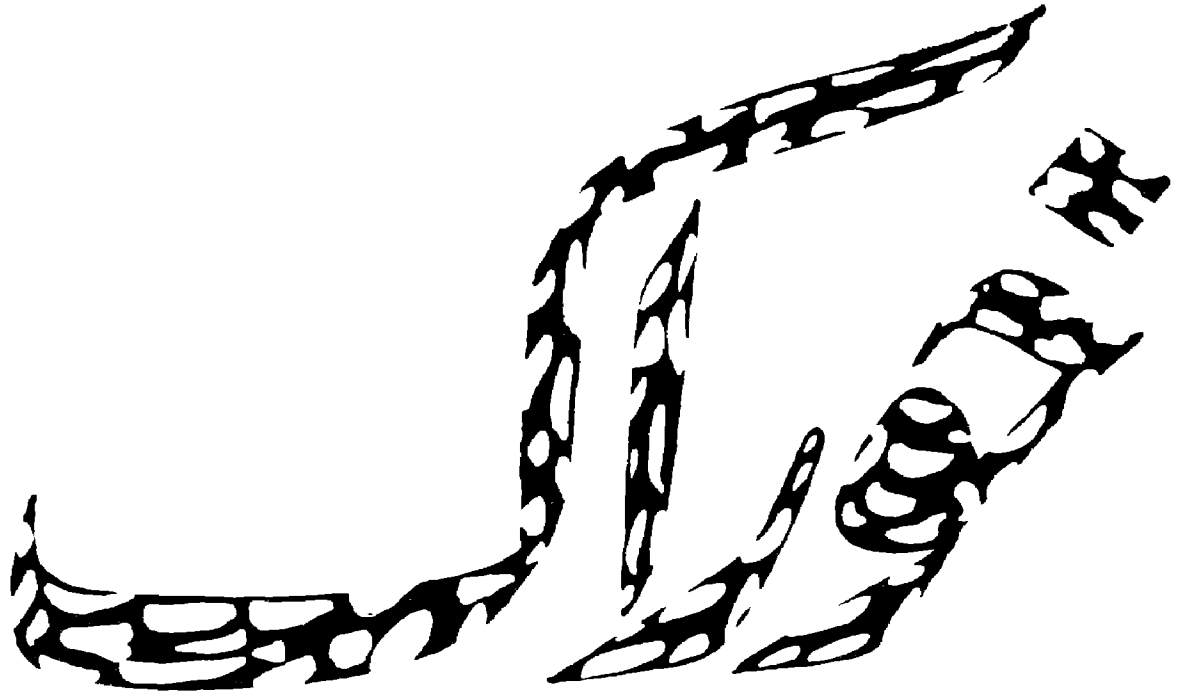
خوراک
ضائع نہ کریں
دوسرے کتنی
لوگوں کو خوراک کی
ضرورت ہے۔
گھروں، پارٹیوں، ہوٹلوں اور
کلبوں میں کھانا ضرورت کے مطابق
ہی لیجیے۔
بچوں کو بھی یہی سکھائیے۔
اس طرح آپ اپنا پیسہ بچائیں گے
اور ملک کا بھی۔
دانہ دانہ
قیمتی ہے
اسے ضائع نہ کریں
davp 73/329